

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222956

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵ ع ۲۰۵ / اردو^۲ Accession No. ۳۸۸۵

Author

Title اردو - مجلہ نثر ۹ - حصہ ۳۵

This book should be returned on or before the date last marked below.

--	--	--	--	--

اردو

۱۳۲

حصہ ۳۵

جولائی سنہ ۱۹۲۹ء

جلد ۹

انجمن ترقی اردو اور نگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

یادگار مولانا شہر مرحوم

دو سالانہ انعام

زبانِ اردو کے محسن مولانا محمد عبدالعلیم صاحب شہر مرحوم کی یادگار میں جناب مولوی عبدالعق صاحب بی۔ اے 'سکرٹری انجمن ترقی اردو' اور جناب مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ نے حسب ذیل دو سالانہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے —

(۱) "عطای عبدالعق"

رسالہ اردو کے سال بہر کے مضامین نثر میں اول درجے کے سب سے اچھے مضمون پر ۱۲۵ روپیہ کلدار کا انعام جناب مولوی عبدالعق صاحب بی۔ اے 'عطا فرمائیں گے —

(۲) "عطیہ ہاشمی"

کے نام سے دوسرا انعام ۱۰۰ روپیہ کلدار کا 'مولوی سید ہاشمی صاحب اُن صاحب کی نذر کریں گے جن کی نظم رسالہ اردو کے سال بہر کی نظموں میں سب سے اچھی اور اعلیٰ درجے کی ہوگی —

ہر سال کے اخیر سہ ماہی میں جو حضرات اہل سمجھے جائیں گے اُن کی خدمت میں رقم ارسال کر کے رسالے میں اس کا اعلان ہوتا رہے گا۔ انعام کی اہلیت کا فیصلہ صرف معطیان کی متفقہ رائے پر منحصر ہو گا —

الحمد
مدیر رسالہ اردو اورنگ آباد دکن

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے ، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے ، ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے ۔ ان تمام مسائل کو حتمی الامکان صحت اور سلیس زبان میں بیان کر کے کی کوشش کی جائے گی ۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلاء بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے ۔ اس رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوا کریں گے —

سالانہ چندہ آٹھ روپے سکے انگریزی (نو روپیہ چار آنے سکے عثمانیہ) —
امید ہے کہ اُردو زبان کے بھی خواہ اور علم کے شائق اس کی - وپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اُردو اوزنگ آباد (دکن)

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون نگار	مضمون	نمبر شمار
۳۶۹	مترجمہ جناب محمد عبدالہاسط صاحب بی اے	خطبات گارسان دتاسی	۱
۳۸۱	جناب مولوی سید معی الدین قادری صاحب	دکھنی مرثیے ایڈنبرا میں	۲
	جناب محمد حفیظ (سید) صاحب بی اے	کھیر	۳
۴۱۳	بی ٹی لکچرار الہ آباد یونیورسٹی		
۴۲۹	جناب مرزا فداعلی صاحب "خنجر" لکھنؤ	اردو کے ان پڑھ شاعر	۴
	مولوی محمد حسین صاحب ایم اے بی ای ٹی	افسانے بولغا اور لکھنؤ کیسے	۵
۴۵۲	صدر مدرس فوقانیہ عثمانیہ بیدر	سیکھا	
۵۱۵	جناب پنڈت برجہوہن ناتھ دتاترے صاحب دہلوی	حضرت کیفی کی دو نظمیں	۶
۵۱۹	از ادیب	مقدمہ چھستان شعرا	۷
		(باہر کہن) مرزا غالب کی	۸
		ایک غیر مطبوعہ غزل	
۵۴۰	ایڈیٹر	قدیم اردو (حسن شوقی)	۹
۵۶۳	ایڈیٹر و دیگر حضرات	تبصرے	۱۰

خطبات گارسان دقاسی

ساتواں خطبہ ۴ دسمبر سنہ ۱۸۵۶ ع

(مترجمہ جلال محمد عبدالباسط صاحب بی۔ اے)

(انگریزی سے اُردو میں مولوی سید وہاب الدین صاحب نے ترجمہ کیا)

حضرات! ہمارے گزشتہ جلسے کے انعقاد کے بعد، ہندوستان کی ایک ایسی سلطنت میں جہاں تمام تر ہندوستانی زبان ہی بولی جاتی ہے، ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے سری رامچندر جی کی کسی بے مالک اودہ (قدیم اجودھیا) کے فرمانروا اعلیٰ حضرت واجد علی شاہ کو تخت سے اتار دیا ہے۔ مجھے اس موقع پر اس خالص سیاسی انقلاب پر تبصرہ یا بحیثیت بادشاہ کے واجد علی کی اچھائیوں یا برائیوں سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مجھے واجد علی شاہ کے ساتھ اس وجہ سے کسی قدر دلچسپی ہے کہ وہ ایک ممتاز ادیب اور بلند پایہ شاعر ہیں، 'احقر' ان کا تخلص ہے، اور وہ آج کل ہندوستان کے آسمان شاعری کے چند درخشاں ستاروں میں سے ہیں، میں اس سے پہلے دوسرے موقعوں پر آپ سب کے سامنے ان کی تصنیفات اور فتائع افکار کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہ اپنے خاندان کے شاہانِ ساف کی روایتوں کے حامل اور تخت و تاج کے ایک لائق وارث ہیں۔ ان کا سارا خاندان ہندوستانی ادبیات کا معین تھا، اور اس کے اکثر افراد خود بھی ادبی فوق رکھتے تھے۔ صفدر جنگ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، جو ہندوستانی زبان کے شاعر تھے اور 'آصف' تخلص کرتے تھے۔ 'سعادت علی خان'، 'غازی الدین حیدر' جو مشہور فارسی

لغت ہفت قلزم کے مؤلف تھے، اور جن کی کتاب کا یہ نام اس وجہ سے ہوا کہ اس میں سات ابواب ہیں۔ نصیر الدینی حیدر، ناصر الدولہ، اور خود واجد علی شاہ معزول کے والد امجد علی شاہ، ان سب کے احسانات ہندوستانی ادبیات پر ہیں۔ واجد علی کو ایسی شریف اور باہمت ملکہ کے بیٹے ہونے کا شرف حاصل ہے، جس نے اگرچہ اپنی عمر میں کبھی سمنہ نہ دیکھا تھا، اور جہاڑ کا نام تک نہ سنا تھا لیکن معض اپنی نسل کے حقوق کی حفاظت کے لئے سات سمنہ پار کا سفر کیا، اور انگلستان پہنچ کر حکومت کے اس ضرر مہل کے خلاف احتجاج کیا۔ جس کا ثکار ان کا بیٹا واجد علی بنایا گیا تھا۔

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے سالانہ خطاب کے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، یعنی ہندوستان کی اس ادبی تحریک کا بیان جو ہندوستانی زبان کے توسط سے ہوئی ہے۔ میں نے کسی موقع پر ہندوستانی زبان کو فرانسیسی کی بہن • کہا ہے لیکن دراصل وہ اس کی خالہ زاد بہن ہے، جس طرح اطالوی زبان فرانسیسی کی خالہ زاد بہن ہے، اور سنسکرت لاطینی کی بہن اور "ہندوستانی" یا "ہندی" یا "جدید ہندوستانی" کی ماں ہے۔

حضرات! لفظ "ہندوستانی" جیسا کہ میں متعدد بار آپ سے عرض کرچکا ہوں، اسم جنس ہے اور اس سے ہندوستان کی اور خصوصاً مالک مغربی و شمالی اور پنجاب کی زبان مراد لی جاتی ہے۔ اردو جسے کسی قدر فارسی آمیز اور عربی آمیز ہندوستانی کہنا چاہئے، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان ہے، اور ان کی راجدھانیوں، ملک دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور حیدرآباد میں نہایت کھری اور خالص شکل میں بولی جاتی ہے۔ ہندی کو ہندوؤں کی ہندوستانی کہنا چاہئے اور یہ زیادہ تر سنسکرت

• ملاحظہ ہو سہرے خطاب المتعاضدہ باب ۱۸۵۴ء کا آخری پیراگراف (مصنف)

+ ملاحظہ ہو میکس مولر (Max Muller) کی کتاب (ہدایات دربارۃ تحصیل السنۃ)

Suggestions in learning the language کا صفحہ ۶- (مصنف)

لفظوں سے ' خواہ' خالص ہوں یا مخلوط، بھری ہوئی ہے۔ ہندی کے لئے عام طور پر دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں دیوتاؤں کی تحریر اور جسے عرت عام میں مہض ناگری کہتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ہندو دوسرے رسم الخط بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً کایتھی اور صرافی، جو دونوں کی دونوں ناگری کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ صرافی رسم الخط مقہورا، علی گڑھ اور مین پوری کے اضلاع کی ہندی تحریر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آگرے میں ناگری مدرسوں کی تعداد کایستھی سے کسی قدر زیادہ ہے، لیکن دوسرے اضلاع میں زیادہ تر کایستھی ہی کا استعمال ہوتا ہے۔ کایستھی تحریر کو کایتھی ناگری بھی کہتے ہیں، یعنی کایتھوں کی تحریر۔ کایتھ، مقامی بولی میں کایستھہ کو کہتے ہیں، یعنی وہ ذیلی ذات جس میں محرو داخل ہیں، مثلاً پٹواری وغیرہ۔ صرافی رسم الخط کا دوسر نام مہاجنی ہے، اور اس کا استعمال زیادہ تر مہاجنوں اور صرافوں میں ہوتا ہے۔ یہ رسم الخط صرف تجارتی بہوار کے لئے مخصوص ہے اور ایک قسم کے آنکڑوں میں لکھا جاتا ہے جسے صرف جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص ناگری حروف تہجی سے تھوڑا بہت واقف ہو تو اس کو صرافی کا حروف شناس بننے میں کچھ زیادہ دقت نہ ہوگی۔ ہاں ایک ایسے ہندیات کے ماہر کو جس نے بجز خوہنما، اور نوک پلک سے درست سنسکرت تحریر کے اور کچھ نہ پڑھا ہو، دیہات کے بنئے کی بدخط کھسیت پڑھنے میں البتہ بہت دقت ہوگی۔ اُردو کی خوہنخط تحریروں میں عام طور پر "نستعلیق" کا استعمال ہوتا ہے جو دو لفظوں نسخ اور تعلیق سے مرکب ہے۔ معمولی اُردو تحریروں میں زیادہ تر "شکستہ" کا استعمال ہوتا ہے۔ خرد اس لفظ "شکستہ" ہی سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تحریر کتنی بے احتیاطی کے ساتھ ہوتی ہوگی۔

سنہ ۱۸۳۴ ع میں ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب میں ہندوؤں کے ۳۷ مطبع اور ۳۳ رسالے وغیرہ تھے۔ رسالوں کی اشاعت ۲۲۱۶ • تک پہنچ گئی تھی۔ اخباروں اور رسالوں میں سب سے زیادہ مقبول اور کثیر الاشاعت لاہور کا اردو اخبار 'کوہ نور' تھا، لیکن اس نے خریداروں کی تعداد بھی ۲۴۹ سے زیادہ نہ تھی! اس کے ایڈٹر ہر سکھہ راتے تھے جو مطبع کوہ نور کے مالک بھی تھے۔ میں اس موقع پر ان اخبارات کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو سال زیر بحث میں انگریزی زبان میں نکلتے تھے۔ اگر ان کی تعداد بھی دیسی زبانوں کے رسالے اور اخبارات میں شریک کر دی جائے تو اس سال سب کی اشاعت مل کر ایک لاکھ باسٹید ہزار چار سو آئید ہو جاتی ہے۔ یعنی پچھلے سال کی اشاعت سے اٹھاون ہزار سات سو تیراؤے زیادہ، اس لئے کہ پچھلے سال کی تعداد صرف ایک لاکھ تین ہزار چھ سو پندرہ تھی! —

جن مطبعوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سال زیر بحث کے اندر اخباروں اور رسالوں کے علاوہ دو سو سات کتابیں مشرقی زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ سنہ ۱۸۵۵ ع کے متعلق میرے پاس صحیح اعداد موجود نہیں ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی کتابوں کی اچھی خاصی تعداد شائع ہوئی ہے۔ غالباً ان کتابوں میں انگریزی زبان کی خاص ادبی تصانیف کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ انگریزی زبان کی ادبی تصانیف کے جو ترجمے آئندہ نئے جائیں گے وہ مستحق تعریف ضرور ہوں گے، لیکن اس شرط پر کہ وہ کوئی ایسی ترمیم یا اصلاح نہ کریں جس سے اردو ادبیات کی خصوصیت میں کوئی تبدیلی

• ملاحظہ ہو 'Allen's Indian Mail' No of August 16th 1836. (مصنف)

(مصنف) 'Alliens Indian Mail' 31st July 1856.

یا کہی واقع ہو جائے، بقول ملٹن ”اتنے زیادہ نفس مذاق نہ بنو کہ غیر یقینی برائیوں کا فیشن ہو جائے“ —

چند ہفتے ہوئے، مسٹر فرانسیس ٹے لہر (Francis Taylor) نے جو دہلی کے ایک دیسی کالج کے پرنسپل ہیں مجھے ان ہندوستانی تصانیف کی ایک فہرست بھیجی ہے جو حال میں سلطنت مغلیہ کی راجدھانی (دہلی) میں شائع ہوئی ہیں۔ اس فہرست میں چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر ہے جو میں نے اب تک آپ حضرات کو نہیں بتائی ہیں۔ یہ کتابیں اردو ادب کے لئے ایک قابل قدر اضافے کا حکم رکھتی ہیں۔ آکرہ گورنمنٹ نے بھی ادارہ فرافسہ (Institute of France) کو ایک سو پچھتر کتابوں کا ایک ذخیرہ تصفیقاً بھیجا ہے، اور اس میں بھی مجھے چند نئی کتابیں نظر آئی ہیں۔ یہ ذخیرہ میرے قابل فخر احباب مسٹر ولیم میور (William Muir) معتمد حکومت مہالک مغربی و شمالی ہند، اور مسٹر ایچ۔ ایس۔ رینڈ (H. S. Reid) ناظم تعلیمات مہالک مغربی و شمالی کے توسط سے وصول ہوا ہے۔ یہ دونوں حضرات ہندوستانی ادبیات کے جو ایک نہ ایک دن ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی ادبیات کی جگہ لے کر رہے گا، بڑے سرگرم معاون اور سرپرست ہیں۔ اگرچہ ان کتابوں کو انگریزی حکومت نے دیسی کالجوں اور مدرسوں کے نصاب میں شریک کرنے کی غرض سے شائع کیا ہے، لیکن یہ یورپی حضرات اور خصوصیت کے ساتھ سیول اور فوجی سکھوں کے اعلیٰ افسروں کے لئے بھی بہت مفید ہیں، جن نے لئے بنگال جیسے صوبے میں رہ کر بھی جہاں کے اکثر اضلاع میں بنگالی بولی جاتی ہے، ہندوستانی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ زبان (ہندوستانی) نہ صرف بنگال کے اکثر مقامات میں بولی جاتی ہے بلکہ کلکتہ، فیض صوبہ بنگال کے دوسرے شہروں کی عدالتوں میں صرف یہی زبان

حضرات! جن دو فہرستوں کا میں نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا ہے، اب ان میں سے میں ایک نئے تذکرے کا حال آپ کو سناتا ہوں۔ اس تذکرے کا نام ”گلستان سخن“ ہے، اور اس کے مصنف مرزا قتادہ بخش المتخلص بہ ’صابر‘ ہیں۔ جو خاندان شاہی کے ایک شہزادے مرزا مکرم بخت کے لڑکے ہیں۔ اس خاندان کا ایک سربراہ آردہ شخص سراج الدین* اب تک شاہ بلکہ بادشاہ کے اقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ صابر مولوی امام بخش ’صہبائی‘ کے شاگرد ہیں، جو آج کل کے اعلیٰ درجے کے ہندوستانی مصنفین میں سے ہیں۔

شعر کا شوق آج تک ہندوستانیوں میں بدستور باقی چلا آتا ہے، لیکن اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا ہے۔ ارسطو اپنی کتاب شعریات‘ باب نہم میں لکھتا ہے کہ ”شاعری‘ بمقابلہ تاریخ کے کہیں (یادہ فلسفیانہ اور سبق آموز ہوتی ہے“ لیکن جو فہرستیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں ان میں ’نظم کی بہت کم نفی کتابیں نظر آتی ہیں۔ یعنی ایک تو ”گیان چالیا“ (چالیس اقوال) جو ہندی دھرم کی شکل میں ہے اور پنڈت شری لال نی اکھو ہوئی ہے جو کئی مفید کتابوں کے مصنف ہیں، اور دوسرو ”پشپ باٹک“ (گلستان) جو گلستان کے باب ہشتم دوبارہ سیرت بادشاہان کا ترجمہ ہے اور بنسی دھر کا کیا ہوا ہے۔ یہ کتاب آگرے میں طبع ہوئی ہے، اور اشاعت اول میں توں ہزار نسخے چھاپے گئے ہیں۔ ایک اور مصنف قہر الدین فاسی نے ”گلستان اردو“ کے نام سے گلستان کی تلخیص کر کے اور ساتھ ساتھ فارسی عبارت بھی دے دی ہے۔ انہوں نے ہستان کے اقتباسات کا بھی اسی طرح ترجمہ کیا ہے۔ ان کا ترجمہ نہایت فصیح اور صحیح ہے —

ان فلسفیانہ اور اخلاقی کتابوں میں جو حال میں ممالک مغربی و شمالی میں چھپی ہیں، سب سے زیادہ قابل ذکر ”صفات رب العالمین“ مصنفہ بابو شری داس ہے۔ ان مصنف کا نام اگرچہ ہندوؤں کا سا ہے اور اس کے معنی ”لکشمی کے غلام“ کے ہیں، لیکن وہ دراصل عیسائی ہیں اور جن چند ہندوستانی عیسائی مصنفین کا ذکر میں نے ابھی کچھ زما نے • اُدھر آپ سے کیا تھا، ان میں ان کے نام کا بھی اضافہ کر لیا چاہئے۔۔۔

ایک اور قابل ذکر کتاب ’بھوج پریندسا‘ ہے یعنی بھوج کی کہاوٹوں کا انتخاب۔ اس پر بنسی دھر نے حاشیہ بھی لکھا ہے۔ آپ سب واقف ہیں کہ بھوج، جسے ہندوستان کا سایمان کہنا چاہئے، مالوے کا ایک مشہور راجہ تھا۔ اس نے پانچویں صدی میں اچین میں حکومت کی، اور ہندوستانی تصنیفات میں اس کا ذکر اکثر آتا ہے۔

’بدھی و دیودیت‘ (کتاب درباره علم عقل) ایک ہندی کتاب ہے، اور اس میں تعلیم و تربیت کے فوائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

’شکھامنجری‘ (گلدستہ معلومات) یہ چند اقتباسات کا ہندی ترجمہ ہے جو ایچ۔ سی، ٹرنر (H. C. Turner) نے ٹان (Tod) کی کتاب ”Hints on Self improvement“ سے لئے ہیں۔ ہندی ترجمہ بنسی دھر کا کیا ہوا ہے۔

میں اس موقع پر ان اخلاقی قصوں کا بیان بھی مناسب سمجھتا ہوں جو حال میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً ’فرخ آباد کی کہانی‘، ’سراج پور کی کہانی‘ اور ’بدھ پھل و دیا‘ (درخت عقل کے پھل)۔ یہ آخری کتاب جو پندت کشن دت، اسٹڈنٹ پروفیسر سنٹرل اسکول، آگرہ کی تصنیف ہے، ایک اردو کتاب، کہو دھی

سبودھی ' کا ہندی ترجمہ ہے ' اس کتاب کا ذکر میں پہلے ساں کر چکا ہوں —

تاریخی کتابوں میں ' جن کی تعداد میری پیش نظر فہرستوں میں سب سے زیادہ ہے ' مجھے ' میر خواند ' کی مشہور کتاب ' روضۃ الصفا ' کا اردو ترجمہ نظر آتا ہے ۔ اس کتاب میں نہایت قدیم زمانے سے لیکر مصنف کے زمانے یعنی سولہویں صدی عیسوی تک کی ایرانی تاریخ بیان کی گئی ہے —

ایک اور کتاب جو ایک مسلمان عالم مولوی عبیداللہ ابومسلم کی تصنیف ہے ' تصفۃ الہند ' ہے ۔ اس میں ہندوؤں کے مذہب کی تشریح کی گئی ہے ۔ یہ جاننا خالی از دہشہ پی نہ ہو گا کہ مسلمان ہندو عقائد کی تشریح کس طرح کرتے ہیں ۔ وہ اگرچہ ان کے عقائد کی شکل کو بالکل نہیں بدلتے ' لیکن ان کو بہت کامیابی کے ساتھ اپنے ذاتی عقائد میں ضم کر دیتے ہیں ۔ میں تاریخی سلسلے کی دو اور کتابوں کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔ ان میں سے ایک تو ' تذکرۃ المشایخ ' ہے ' جس کے مصنف سدا سکھ لال ہیں ۔ یہ کتاب سوانح سے تعلق رکھتی ہے ' اور انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہے ۔ دوسری کتاب ولسن کی Manual of Ancient History کا اردو ترجمہ ہے جو تاریخ عالم کے نام سے کیا گیا ہے ۔ اس کتاب کا ایک ہندی ترجمہ بھی ' جگت درقازت ' (تاریخ عالم) کے نام سے شائع ہوا ہے —

جدید مطبوعات میں ' اخلاقی تصانیف کا حصہ بھی اہم ہے ۔ میں سب سے پہلے ' چھندو دی پکا ' (ہروس کا چراغ) کا ذکر کروں گا ۔ یہ رسالہ ہندی عروض پر ہے ' اور سنہ ۱۸۵۴ ع میں آگرے میں چھپا ہے ۔ اب تک ہندی زبان کے ہروس سے کوئی واقف بھی نہ تھا ' اور جس طرح اردو عروض فارسی عروض کو کسی قدر بدلی ہوئی شکل ہے ۔ اسی طرح ہندی عروض ' تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ' بالکل سلسلہ عروض کی طرح ہے ۔ لیکن اس موضوع (ہندی عروض) پر ایک رسالے کی پھر بھی ضرورت تھی ' اور ہنسی دھر نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے —

صرف و نحو کی اس کتابوں کا ذکر جو حال ہی میں ہندی اور اردو دونوں زبانوں

میں شائع ہوئی ہیں، طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ یہ قواعد جتنے اردو اور ہندی سے متعلق ہیں، اتنے ہی فارسی اور سنسکرت سے، پھر بھی مجھے امید ہے کہ اگر یورپی حضرات انہیں پڑھیں گے تو انہیں ان سے کئی نئی باتیں حاصل ہوں گی۔

مذکورہ بالا کتب کے بعد افشا کی کتابوں کا نمبر ہے۔ ان میں حسب ذیل کتابیں نظر آتی ہیں:—

پتر مالی کا (پتییوں کا ہار) مصنفہ شری لال، ہندی زبان میں؛
'افشائے خردا نروز' مصنفہ قہر الدین، اردو میں۔ اس کتاب کے متعدد ادیشن نکل چکے ہیں، اور ہزاروں نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔

افشائے خلیفہ، ید فارسی کتاب 'افشائے شاہ محمد' کا اردو خلاصہ ہے، فارسی عبارت بھی ساتھ ساتھ دی گئی ہے۔ افشائے شاہ محمد، ہندوستان میں بہت مستند مالی جاتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مالک مغربی و شمالی کے فاضل ناظم تعلیمات مسٹر ریڈ نے جب سنہ ۱۸۵۳ - ۱۸۵۴ء میں دیہی مدارس کا دورہ کیا تو انہیں تھیں سو تینتالیس مدرسوں کے طالباء کے ہاتھوں میں یہی کتاب نظر آئی —

ایک اور کتاب 'سدہ دریں' (پاکستان کا آئینہ) ہے۔ یہ ہندوستانی زبان میں ہے اور اس میں آداب و اخلاق کے متعلق ہندوؤں کے نقطہ خیال کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف سیتھہ بدھی چند نارائن انسپکٹر مدارس 'متھرا' ہیں۔ یہ صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں —

'ہدیانکر' ہندی زبان میں شری لال کی تصنیف ہے۔ اسی کو ہنسی دھر نے 'حقائق الموجودات' کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں موجودات عالم 'ستارے' نظام شمسی، حرارت، روحانی، کرۂ ہوا، کھر، بادل، دنیا، حیوانات، بذات معدنیات وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے —

اب میرا فرض ہے کہ فی زراعت پر جو چند کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، ان کا

بھی ذکر کروں۔ ان کا مطالعہ ہماری ذراعتی انجمنوں کے لئے یقیناً پر از معلومہ ہوگا۔ یہ کتابیں حسب ذیل ہیں:—

”کھیت کرن“ اس کے مصنف کالی رائے تپتی کلکتر فتم گڈہ ہیں۔ یہ آج کل کے ایک مشہور مصنف ہیں۔ کتاب ہندی میں ہے اور اس میں ممالک مغربی و شمالی کے ہندوستانی کاشتکاروں کے دستور اور طریقوں کا حال درج ہے۔ یہ رسالہ آگرہ اور دہلی دونوں جگہ کئی کئی بار اردو اور ہندی میں چھپ چکا ہے۔ اس میں مختلف قسموں کی مٹی، طرح طرح کے اوزاروں اور آب پاشی کے مختلف طریقوں کا بیان کیا گیا ہے۔ نیز تحصیل مالگنداری کے طریقوں کا حال اور زائد تحصیل کے متعلق چارہ سوئی کوٹے کی ہدایتیں بھی کی گئی ہیں۔ اس رسالے میں نقشے بھی ہیں اور اصطلاحیں فارسی اور دیوناگری دونوں تحریروں میں دی گئی ہیں۔ —

”کسان پدیش“۔ اس کے مصنف ہنسی دھر ہیں۔ کتاب ہندی میں ہے اور اس میں یہی آپادی ملکیت کے کھاتوں، نیز پتواریوں کے سالانہ حساب وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہی کتاب ہے جو موہن لال اور روشن علی کی متفقہ کوشش ہے اردو میں، ”ہند فامہ کاشتکاراں“ کے نام سے چھپ چکی ہے۔ یہ دونوں حضرات تعلیم یافتہ اور آج کل کے ممتاز اہل قلم ہیں اس کتاب کا ایک فارسی اردو اتیشن بھی ہے۔ —

اگرچہ مجھے اس کا احساس ہے کہ اتصاری بہت کچھ کوشش کے باوجود بھی اسمائے کتب کی فہرست بہت طویل ہو گئی ہے، لیکن میں اس میں ایک کتاب کے اضافے کی جسارت اور کروں گا۔ اور وہ میری کتاب ”ہندوستانی زبان کے مصنفین کا تذکرہ“ کا اردو ترجمہ ہے، یہ ابھی حال ہی میں دلی

سے شائع ہوا ہے اور اس کے مترجم محمد ذکاء اللہ ہیں۔ ابھی تبیں ہی ہوئے اس ترجمے کی چند جلدیں مجھے وصول ہوئی ہیں۔ مجھے اعتراض کرنا پڑتا ہے اور مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ دلکش ہندوستانی زبان پر میری یہ ادنیٰ درجہ کی تصنیف خود ہندوستانیوں میں مقبول ہوئی۔ میری تصنیف نے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کئے جانے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے، چند سال پہلے میری ایک اور کتاب ”تاریخ ادبیات ہندوستان“ (History of Hindustani Literature) کا ”طبقات شعراے ہند“ کے نام سے اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایسی مدارس کے لئے جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ بہ یک وقت ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شایع ہوئی ہیں تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ایکساں طور پر ان سے مستفید ہو سکیں۔ اکثر یہ فارسی زبان میں بھی شایع ہوئی ہیں، جسے ہندوستانی مسلمانوں کی لاطین سمجھنا چاہئے اور جسے مدارس میں (اور ہندوؤں کے مدارس میں بھی) اردو کے ساتھ ساتھ سکھایا جاتا ہے، اعلیت یہ ہے کہ اردو سیکھنے کے لئے فارسی زبان سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔

حضرات! میں نے آپ کو ان مذہبی کتابوں کا حال نہیں بتایا ہے جو سرگرم مبلغین دیسیوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے شایع کرتے رہتے ہیں۔ ایسی کتابوں میں عہدنامہ، قدیم اور خصوصیت کے ساتھ عہد نامہ جدید کے ترجمے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ چاہے ان مقدس کتابوں کو پڑھ کر بہت کم ہندوستانیوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہو تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن لوگوں نے انہیں پڑھا ہے ان کی زندگی پہلے سے بہتر اور زیادہ خوشی کی ضرور ہو گئی ہے، کیوں کہ

بقولینگ (Young) —

”کئی مکی حیات سے گوشہ نشین ہونے کے بعد انجیل

پڑھو اور خوش رہو اس میں ایسے حقائق کی کثرت ہے
 جن سے زندگی کا سکون بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے۔
 اس کے مقدس صفحے کو پڑھو، اور اس کا احترام کرو،
 وہ ایک ایسا صفحہ ہے جہاں ”ابدیت“ کی فتم
 نظر آتی ہے، ویسا ایک صفحہ ساری مخلوقات مل
 کر بھی کوشش کرے تب بھی پیدا نہیں کر سکتی۔
 اور زردست سی زبردست آگ بھی اسے ہرباہ نہیں
 کر سکتی۔“ —



دکھنی مرثیے ایڈنبرا میں

(پہلی قسط)

از

(جلاپ مولوی سید معصی الدین قادری صاحب)

[اردو ادب پر غور کرنے والوں کو یہ خبر خوش کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ سرزمین اسکاٹ لینڈ کے قدیم اور خوبصورت دارالحکومت ایڈنبرا میں اس زبان کے چھ دس محفوظے بھی محفوظ ہیں، جن میں سے دو تین ضرور قابل قدر ہیں کیونکہ اُن کی وجہ سے اردو زبان کا ایک اہم دور ایک حد تک روشنی میں آجاتا ہے -

ان قابل فکر مضبوطوں میں سے فی الحال دکھنی مرثیوں کے متعلق دوسری معلومات کی پہلی قسط پیش کی جاتی ہے تاکہ اُردو کی تحقیقات کرنے والے اُن سے ناواقف نہ رہیں -

کتب خانہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی کے کٹلاگ میں "مراثی ہاشم علی" کے عنوان کے تحت ان کی دو جلدوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن دراصل ان میں سے ایک تو ہاشم علی کے تقریباً تھائی سو مرثیوں کا مجموعہ ہے جس کو مصنف نے "دیوان حسینی" کے نام سے موسوم کیا ہے، اور جس کے متعلق چند معلومات اس مضمون میں پیش کی جائیں گی۔ اور دوسری جلد ایک "بیاض" ہے جس میں قریب اسی (۸۰) شاعروں کے تھیں سو مرثیے ہیں۔ انصوس ہے کہ یہ بیاض ابتدائی اور آخری صنعتوں کے لحاظ سے نامکمل ہے۔ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ

حقیقت میں اس کا کہا حجب نہا۔ اور اس وقت اس میں اول اور آخر سے
کتلے کتلے صفحہ فائب ہوں۔

اس بیاض پر تفہیل سے کچھ لکھنے کے لئے خاص فرصت درکار ہے۔ تاہم
اس میں جن جن شاعروں کے مرثیے موجود ہیں ان کی میں نے حروف تہجی
کے لحاظ سے ایک فہرست ترتیب دے لی ہے جو اس مضمون کے مسیمہ کے
نام پر پیش کی جاتی ہے تاکہ اہل تحقیق و تفتیش کو فی الحال کچھ
معلومات حاصل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ خود اس بیاض کی جو تفصیلی
فہرست تیار کی گئی ہے وہ کسی دوسری قسط کے ساتھ پیش کی جائے
گی۔ اُس کی مدد سے آئندہ تحقیق کرنے والے 'بیاض میں خاص خاص
شاعروں اور مرثیوں کا صحیح سلسلہ تاخیر و تقدم معلوم کرے' اُن کے زمانے
و پیرہ کے متعلق کوئی پتہ چلا سکے۔

چونکہ ان چہتہوں سے پہلے اس مضمون کا ختم کر دینا ضروری تھا
اس لئے جو کچھ لکھا گیا ہے بالکل روا روی اور جلدی کا نتیجہ ہے اور
اس کے علاوہ چونکہ اس مضمون کا سارا مواد صرف مرثیوں کے زیر نظر
دو جلدوں اور سیدی موجودہ یاد پر مبلی ہے اس لئے مہرا خیال ہے کہ اکثر
جگہ مجھے بہت ہی اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔

محمد مصطفیٰ الدین قادری

کعب خانہ ایڈنبرا یونیورسٹی

۶ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

دکنی مرثیوں کی ابتدا کے متعلق فی الحال کوئی تحقیقی بات نہیں کہی
جاسکتی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہاں بہت قدیم زمانے ہی سے مرثیہ گوئی
کے آغاز ہو چکا ہوگا، کیونکہ بیجاپور اور گولکنڈا دونوں حکومتیں تقریباً شروع ہی
سے شیعہ مذہب کی پیروی تھیں۔

ہمارے زیر نظر مسخوطوں کو اردو مرثیہ گوئی کے آغاز سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اس زمانے کے مرثیے ہیں جب دکھنی مرثیہ گوئی کمال کو پہنچ چکی تھی۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ دکھن کی شیعہ سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ہی اس کو بھی زوال نہیں شروع ہوا بلکہ اس کا سلسلہ باقی تھا۔ یہاں تک کہ بعد میں شمالی شاعروں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیکر اس میں اور بھی ترقی دی، اور آخر کار 'افیس' اور 'دبیر' جیسے استادوں نے تو اس کو اوج کمال پر پہنچا دیا۔

یہ کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ دکھن میں 'اس گئے گذرے زمانے میں بھی' مرثیہ گوئی برا بر جاری رہی۔ اور اس طرح 'ہاشمی' اور 'سوزا' اور 'افیس' اور 'دبیر' کے درمیانی زمانے میں مرثیوں کی زمین بالکل بنجر نہیں پڑی رہی۔ زیر نظر مرثیوں کے مطالعہ کے بعد یہ خیال دور ہو جاتا ہے کہ اردو مرثیہ گوئی دکھن میں شروع ہو کر بالکل ختم بھی ہو گئی۔ اور یہ کہ شمالی شاعروں کو از سر نو مرثیہ گوئی کا آغاز کرنا پڑا۔

دکھنی مرثیوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا مرثیہ پن ہے۔ اور اس حیثیت سے وہ شمال کے مرثیوں سے متفرق ہیں۔ وہ مرثیہ گوئی کے اصلی مقصد کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ ان کا مقصد رونے رلانے کے ہوا کچھ نہیں۔ شمال میں بھی ابتدا میں یہی رجحان تھا۔ لیکن 'افیس' اور 'دبیر' نے اس کے رخ کو بالکل بدل دیا اور ان کے یہاں مرثیے اردو شاعری کے اہم تر جزو بن گئے۔ اس میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے کہ دکن میں بھی اس طرح کا رجحان شروع ہو چکا تھا کہ مرثیہ نگاری میں رونے رلانے کے علاوہ شعریت کا بھی اعطا رکھا جائے جیسا کہ 'روحی' 'رضی' 'قادر' 'ندیم' اور 'نظر' وغیرہ کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ بات عام طور پر مقبول نہیں ہوئی تھی۔ ایک دفعہ 'عزت' نے اپنے مرثیے کے آخر میں اشارہ کیا تھا کہ :-

خام مضمون مرثیہ کہلے سوں چپ رہنا بھلا
 پختہ درد آمیز عزت ناستوں احوالات بول
 مگر اس کے ایک بڑے ہم عصر 'رضا' نے مرثیہ کے اصطلاحی مضمون اور مقصد
 کو دلیل بنا کر اس طرح اس کا جواب پڑھا کہ :-

اے عزیزاں گرچہ 'عزت' مرثیہ میں یوں کہیا
 خام مضمون مرثیہ کہلے سوں چوپہ (کذا) رہنا بھلا
 لیکن اس مظلوم بے سر کا بیاں کرنا روا
 تاکہ سن کر یوں بیاں ہوویں محبا اشک بار

اگرچہ شمالی مرثیوں کی طرح دکھنی مرثیہ موضوع کے لحاظ سے زیادہ
 مضمون خیز نہیں ہیں تاہم ان میں بھی امام زادہ علی اصغر کی شہادت اور
 امام قاسم اور بی بی سکینہ کی شادی اور پھر ہمیشہ کی جدائی پر بہت کچھ
 توجہ صرف کی گئی ہے۔ خصوصاً علی اصغر کی شہادت پر دکھوں کے قریب قریب ہر
 مرثیہ کو لے نئے نئے طریقے سے ماتم کیا ہے۔

اس امر کا اظہار بھی شمال اور جنوب کے اردو مرثیوں کا مقابلہ مطالعہ کرنے
 والوں کے لئے شاید غیر ضروری نہ ہوگا کہ دکھنی مرثیہ بالعموم موبع بندوں کی
 شکل میں لکھے گئے ہیں۔ ہر مرثیہ کے پہلے بند کے چار مصرعے ہم قافیہ و ہم
 ردیف ہوتے ہیں۔ لیکن ہر بند کا چوتھا مصرعہ اسی ردیف اور قافیہ میں لکھا
 جاتا ہے جو ابتدائی بند کا ہوتا ہے۔ چند مرثیے مضمون کی شکل میں بھی ہیں۔
 اور سلام، درود، اور فاتحہ وغیرہ کے موضوع کے لئے عموماً غزل کی شکل استعمال
 کی گئی ہے۔

دکھنی مرثیوں کی ایک دور خصوصیت ان کی تاریخی معلومات ہیں۔
 اس بارے میں وہ شمالی مرثیوں سے زیادہ اہم ہیں۔ ان کے شاعروں کے نام
 ان کی زندگی، ان کے وطن، اور زمانے وغیرہ کے متعلق بھی معلومات ہوتے

ہیں۔ اور یہ باتیں اس لئے زیادہ اہم ہیں کہ ان مرثیہ نگاروں پر اس وقت کسی اور ذریعے سے کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

دکنی مرثیہ نگاری کی نسبت اس وقت ان چند اشاروں کے قیام پر کرنے کے بعد اور ہاشم علی کے متعلق بعض فوت پیش کرنے سے پہلے اس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہاشم علی پر اس لئے نہیں قلم اٹھایا جا رہا ہے کہ وہ بہترین دکنی مرثیہ گو ہیں بلکہ اس لئے کہ اس وقت سب سے زیادہ انہیں کے مرثیے موجود ہیں۔

(۲)

اس وقت جس مرثیہ گو پر ہم چند فوت لکھیں گے اس کا نام ہاشم علی ہے۔ ان ہاشم علی کو نصرتی کے ہم عصر ہاشمی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات یہاں ضرور ملحوظ رہے کہ ہاشم علی کبھی مرثیے میں خود کو ہاشم یا ہاشمی نہیں لکھتے۔ ان کے دیوان (یعنی مجموعۂ مرثی) کے مطالعہ کے وقت میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ کہیں صرف لفظ ہاشمی کا استعمال دیکھوں مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے کسی مرثیے کے آخر میں ہاشم علی کے سوا کوئی اور تخلص نہیں پایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بیانی مرثی میں مجھے ایک ایسا مرثیہ ملا جس کے آخری شعر یہ ہیں۔

تھا اے ہاشم مجھ کوں عظمت ترک اشعار جدید

(عزم ۱۹)

بس کے دل میں ہجوم درد حسنین شہید

اشک کے طفلان ہو دامن گیر ماتم کر مزید

لوم دل میں یو - طرغم کی مٹانے فین دایم

تو میں نے اس کو ہاشم علی کے مرثیوں کی فہرست میں نہیں داخل کیا،

بلکہ جیسا کہ اس مضمون کے آخر میں فہرست ملاحظہ کر لے سے واضح ہو گا،

ہاشم اور ہاشم علی دو علاحدہ علاحدہ نام لکھے ہیں - تاہم ہاشم پر استفہامیہ لگادیا ہے - ممکن ہے کہ خرق عادت کے طور پر ہاشم علی نے ایک دفعہ ہاشم تخلص بھی استعمال کر دیا ہو !

ہاشم علی ، عادل شاہی ہاشمی ہے تقریباً ایک صدی بعد کے شاعر ہیں - وہ ولی اورنگ آبادی کے ہم عصر تھے اُن کے موجودہ دیوان میں ایک دو تاریخیں ایسی ملتی ہیں جن سے اُن کے زمانے کا صحیح تعین ہو سکتا ہے --

۱۔ مرقیہ نمبر ۲۰ کے عنوان کے طور پر انہوں نے حسب ذیل عبارت لکھی ہے

”..... از جملہ تفضلات امام شہید کہ ہرین عاصی شدہ آنست کہ

برادر ایمانی حافظ فضل الدین در عالم رویا بقاریع بیستم ماہ

مبارک رمضان سنہ ۱۱۴۸ ہجری یک ہزار (۹) و چہل ہشت مشاہدہ

نمود کہ گویا پائے علاوہ (الاوہ - موجودہ) آنحضرت نشستہ و مہبان

جمع شدہ اند کہ یکایک از شکل ضریح سوز (۹) صدائے برآمد

حاضران مجلس ہمگی بہ تعظم اُن برخاستہ ، دست ہائے ادب

بر سینہ فہادہ ، بچہ امتحان فدائے روح افزا ہیلے سراپا گوش

گشتند ، کہ بار دیگر آواز برآمد ، و نام قایل بیان غم بر زبان

رازدند کہ کجاست ، چوں ایں کہینہ را فیز دران مہفل حاضر دید

کہ با فیز تمام سر را قدم ساختہ فزدیک ضریح مقدس آمدہ ایستاد

بار سیوم حکم عالی صادر شد کہ آن مرثیہ وادیل را بخوان - حسب

فرمان وہی ترجمان شروع بخواندن نمود کہ ازاں خواب بدو بیدار

شدہ اینہ پائے ملخو آنست کہ در بارگاہ سلیمانی وصول شدہ “ -

اس سے جہاں مصنف کے مذہبی معتقدات پر روشنی پڑتی ہے ، جس پر آئندہ

نظر ڈالی جائے گی ، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم علی سنہ ۱۱۴۸ ہجری میں خاصے

مشہور مرثیہ گو ہو چکے تھے - اور اُن کے مرثیے اس قدر پر اثر سمجھے جا چکے تھے کہ

اُن کی داد دینے اور سننے کے لئے اُن کے اعتقاد کے مطابق حضرت امام حسین بھی اُن کے ایک دوست کے خواب میں تشریف لائے تھے۔

۲- ایک جگہ (یعنی سرقیہ نمبر ۱۷۵ کے آخر میں) مرثیے کی تاریخ تصدیف

یوں بیان کی ہے :-

جب منجم نے کیا اس درد نامہ کا حساب غین و قات و سین و طایار قم اندر کتاب
سن کے یو تاریخ کوں سینے میں مل ہوتا کھاب ختم کر ہاشم علی قاسم کی شاہی کے بین
گویا یہ سرقیہ سنہ ۱۱۶۹ھ میں لکھا گیا ہے —

اُن دو فوشہادتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم علی کی بارہویں صدی ہجری کے آخر یا بارہویں کے اوائل میں پیدا ہوئے ہوں گے اور یہ کہ بارہویں کے آخر میں انتقال کیا۔

ایک اور طرح سے بھی ہاشم علی کے زمانہ پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہاشم علی نے اپنے مرثیوں میں دکن کے مشہور شاعر 'قادر' کا دو دفعہ ذکر کیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ تو قادر کی زندگی میں اُن کی طرف اشارہ کیا اور دوسری دفعہ اُن کی وفات کے بعد —

'قادر' دکن کے بہترین مرثیہ گوئیوں میں سے ہیں۔ کجرات اُن کا وطن نہیں تھا بلکہ دکن کا کوئی حصہ۔ یہاں اُن کے ۱۷ اعلیٰ درجہ کے مرثیے موجود ہیں۔ ان میں کل ۳۰۵ شعر ہیں اور بلافاصلہ مقدار خود ہاشم علی اور غلامی کے سوا یہاں سب سے زیادہ انہی کے مرثیے ہیں۔ اگرچہ خوبی و کلام کے مد نظر فی الحال اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا غلامی بہتر ہیں یا قادر؟

'قادر' ہاشم علی کے ہم عصر تھے۔ اُن کے مرثیوں میں سے ایک میں عجیب طرح سے تاریخ تصدیف کا ذکر آیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں —

سن اکیارہ سو اوپر اونھاس سال سبز بانا قادرا کا لہو میں لال
ختم کریو سرقیہ پایا وصال (۹) ہاے کیا غم 'غم پہم ہے مستقیم

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قادر سنہ ۱۱۴۹ ہجری میں زندہ تھے - اور چنانچہ

جب ہاشم علی نے یہ شعر لکھا -

ہاشم علی عجب نہیں یو مرتبے کوں سن کر تجھ پر خلیفہ قادر تعسین کرے دکھن میں
وہ بقیہ حیات تھے لیکن اس کے بعد ہی (اور بہت ممکن ہے کہ سنہ ۱۱۶۰ھ سے
پہلے ان کا انتقال ہو گیا - کیوں کہ ایک دوسرے مرتبے میں ہاشم علی کہتے ہیں -

ہزار حیف نہیں شاعران دکھن سو 'روحی' و 'سرزا' او 'قادر' نہیں

ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تینوں ان کے سامنے سرکٹے تھے اور ان کی وفات پر

ہاشم علی کو افسوس ہو ہوا تھا -

اس تمام تفصیل سے یہ ثابت کرنا بھی مقصود تھا کہ سنہ ۱۱۴۸ھ اور سنہ ۱۱۶۱ھ

سے متعلق ان کی ذاتی شہادتوں کے علاوہ سنہ ۱۱۴۹ھ کی بھی ان کے زمانہ کے متعلق

ایک بالواسطہ شہادت موجود ہے -

اسی سلسلے میں ان شاعروں کی نسبت بھی کچھ لکھنا دلچسپی سے خالی

نہیں جن کا ہاشم علی نے ذکر کیا ہے اور جس سے ان کا ماحول بھی معلوم

ہوتا ہے -

'قادر' کے ساتھ ایک ہی مصرعہ میں 'روحی' اور 'سرزا' کا تذکرہ کرنا ضرور قابل

توجہ ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سرزا سے دکن کے ان دو شاعروں سے کوئی

ایک مراد ہے جن میں سے ایک کا تعلق بیجاپور سے تھا اور دوسرے کا گولکنڈے سے -

بیجاپور کے سرزا کو انتقال کئے ہوئے اس وقت تک غالباً بہت زمانہ گذر گیا ہوگا

کیونکہ موجودہ معلومات کی بنا پر ان کا انتقال علی عادل شاہ ثانی ہی کے زمانہ

میں یعنی سنہ ۱۰۸۳ ہجری سے پہلے ہو چکا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہاشم علی جن

سرزا کا ذکر کر رہے ہیں وہ یقیناً وہ سرزا ہیں جو یا تو ان کے ہم عصر تھے یا جنہوں

نے ان کے قریبی زمانے میں انتقال کیا تھا -

گولکنڈے کے مرزا مکی ہے ہاشم علی کے زمانے تک زندہ ہوں۔ کیونکہ سنہ ۱۰۶۸ھ

کے بعد ان کا بقیہ حیات ہونا مسام ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ پچیس تیس سال اور بھی زندہ رہے ہوں ۔ لیکن یہاں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ گولکنڈے کے مرزا سے عام طور پر مرثیے نہیں منسوب کئے جاتے ۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ صرف بیجا پور کے مرزا مرثیہ کو تھے ۔

یہ بحث اس لئے بھی زیادہ قابل توجہ ہے کہ اسی پران پندرہ مرثیوں کی قسمت کا فیصلہ منحصر ہے جو یہاں ”بیاض“ میں مرزا کے نام سے موجود ہیں اور جن میں تقریباً ۲۱۵ شعر ہیں ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ان مرثیوں کے مصنف گولکنڈے ہی کے مرزا ہیں تو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ سنہ ۱۱۵۰ تک زندہ بھی تھے ۔ کیونکہ مرزا کے جو مرثیے یہاں موجود ہیں ان میں ایک جگہ قادر کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ گویا وہ اس وقت مرچکے تھے ۔ مرزا لکھتے ہیں :-

یہ مرثیہ ہو تراب سیتے قبول پاوے تو کھپہ عجب نہیں

دہ روح قادر کی زار روئے پڑے جو مرزا دکن میں غم تھیں

یاد رہے کہ مرزا جیسا کہ ان کے ایک متذکرہ شعر سے ظاہر ہوتا ہے سنہ ۱۱۴۹ھ تک زندہ تھے --

اس میں بہت کم شک کی گنجائش ہے کہ ’مرزا‘ ’قادر‘ کی طرح دکن ہی کے شاعر تھے ۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں --

در ملک ہند ، یورپ و پچیم ہے سوگ میں

سب سے ادھک عزا ہے بہ دکھن حسین کا

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا کے مرثیے اس سچوہے کے بہترین مرثیوں میں سے ہیں ۔ اُن کا مصنف یقیناً ایک اعلیٰ درجے کا اور بختہ شاعر ہوگا --

پس یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہاشم علی نے جس مرزا کا ذکر کیا ہے وہ گولکنڈے کے مرزا ہیں جنہوں نے سرٹیپے بھی لکھے اور جو سنہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ بھی تھے۔ یا یہ کہ وہ دکن کا کوئی اور بڑا سرٹیپہ گو شاعر تھا جو ولی 'ہاشم علی' اور قادر کا ہم عصر تھا اور جس نے قادر کے بعد اور ہاشم علی سے پہلے انتقال کیا۔۔

اس بحث کو بند کرتے وقت میں اپنا یہ اندیشہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ یہ سب سرٹیپے ایک ہی مرزا کے ہوں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ بیانی جمع کر کے والے نے (جس طرح بعض قدیم شاعروں مثلاً ہاشمی اور شاہی کے سرٹیپوں کے نمونے دئے گئے ہیں) یا بعضوں مثلاً بسمل اور ہادی کے فارسی سرٹیپے بھی شامل کر لئے (قطب شاہی مرزا اور ہادی شاہی مرزا دونوں کے سرٹیپے نقل کر لئے ہوں) اور پھر ہماری بدقسمتی سے اس کا خیال نہ رکھا ہو کہ ہر سرٹیپے پر اس نے خاص مصنف کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اگر واقعی یہ سرٹیپے دو مختلف شاعروں کی پیداوار ہیں تو نہ معلوم آئندہ ایسا موقع بھی آسکے گا کہ کوئی خدا کا بندہ دو شاعروں کے سرٹیپے علیحدہ علیحدہ کر کے ہر حقدار کو اس کا صحیح حق پہنچائے۔

ہاشم علی کے مقذکرہ شاعروں میں تیسرا نمبر روحی کا ہے۔ بیانی میں ان کے زیادہ سرٹیپے موجود نہیں ہیں۔ تاہم جس قدر بھی ہیں اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ روحی کے سرٹیپوں میں شعریت اور تغزل کا جتنا رنگ غالب ہے کسی اور دکنی سرٹیپہ کو ان کے یہاں نہیں۔ یہاں ان کے کل پانچ سرٹیپے ہیں جن میں پچاس سے بھی کم شعر ہیں۔

روحی ایک اچھے شاعر ہوں گے۔ ان کے سرٹیپے ان کی خوبیء کلام کا پتہ دیتے ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف سرٹیپہ کو نہیں تھے غزل کوئی بھی خاصی مشق کی ہوگی۔ ایک سرٹیپے سے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

تا کہ اس کا اندازہ ہو کہ روحی جیسے کامیاب شاعر بھی عزلت کے
 ہم خیال تھے —

آج فم ذاک ہیں چمن کے گل
 ہلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
 غم زدہ سینہ داغ حیران ہیں
 فرگس ، لالہ ، یا سمن کے گل
 یوں نہ لالے شفیق کے دستے ہیں
 لہو میں توجہ ہیں سب گگن کے گل
 جب سلعے شہ کی بات مجلس میں
 جل بھیجے شمع انجمن کے گل
 نقش پا دیکھ دہل ہوس رکھتا
 سر پہ رکھنے کوں تجھ چوں نے گل
 خواہی لگے تجھ طبع میں اے روحی
 دل کے باغان منے سطن کے گل

نہ معلوم اس طرح کے مرثیوں کو دیکھنے کے بعد ، رضا ، کا کیا

حال ہوا ہو —

روحی کی زندگی کی نسبت فی الحال کوئی معلومات نہیں ۔ ' قائم ' نے اپنے
 تذکرے میں الہتم ایک روحی کا ذکر کیا ہے جو حیدرآباد کے پیر زادے تھے ۔ مگر
 نہ معلوم وہ بزرگ یہی روحی ہیں یا کوئی اور ؟ یہ ظاہر ہے کہ ان روحی کا
 ہاشم علی کی زندگی ہی میں انتقال ہو چکا تھا —

ہاشم علی کے دیوان میں ایک اور شاعر کا بھی ذکر آتا ہے ۔ وہ اپنے

مرثیے نمبر ۱۰ کے عنوان میں لکھتے ہیں :-

” تضحیں غزل خواجہ حافظ شہرازی کہ حافظ رضی فاسی شاعر فیض کردہ ہوں “ ۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حافظ رضی جن کے نو مرثیے بیاض میں موجود ہیں ' اور جو اچھے مرثیہ گوئیوں میں سے ہیں ' ہاشم علی کے زمانے سے پہلے گذرے تھے یا انہی کے زمانے میں تھے . رضی غالباً کجرات کے شاعر تھے . خود انہوں نے حافظ کی مشہور غزل " دل می رود ز دستم صاحبداں خدا را " کو تضمین ایک اور شاعر ' بے خبر ' کی نقایذ میں درج ہو گئی . " بیاض " میں ' بے خبر ' کی تضمین کے بعد ہی حافظ ' رضی ' کی تضمین نقل کی گئی ہے . لیکن حافظ ' رضی ' کا یہ مرثیہ ' بے خبر ' اور ہاشم علی دونوں کے مرثیوں سے بہتر ہے —

ہاشم علی کے زمانے اور ان کے قریبی شاعروں پر چند نوت لکھنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے وطن کی نسبت ان کے کلام سے جو روشنی پڑتی ہے اس کو بھی ظاہر کر دیا جائے —

کتلاک کے مرتب نے انہیں برہان پوری لکھا ہے ' اگرچہ ان کے مرثیوں سے اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا . ان سے صرف اس قدر عام ہوتا ہے کہ وہ کجرات کے شاعر تھے ' اور غالباً اس شہر میں رہتے تھے جس کو وہاں کے باشندے شاید ' نگر ' کہتے ہوں . کیونکہ اچھے مرثیوں میں انہوں نے دو دفعہ نگر کا اس طرح ذکر کیا ہے :

۱ - شہ کے ہم میں آج اے ہاشم علی زینہار ہر گز نہ کرتوں بے دلی
سن نگر میں شور محشر ہر گلی ہے شب قتل شہیداں آج رات
(مرثیہ نمبر ۴۳ کے آخری شعر)

۲ - یو نگر میں شور شہ کے باج ہے اس الم کا فالہ کھر کھر آج ہے
(مرثیہ نمبر ۴۸ کا آخری شعر)

یہاں لفظ ' نگر ' برہان پور کے لئے ممکن ہے بالکل اسی طرح استعمال کیا گیا ہو جس طرح شہر حیدرآباد دکن کو وہاں کے لوگ اختصار کے لئے بالعموم بلدہ یا شہر کے لفظوں سے یاد کرتے ہیں —

رہا اس کا ثبوت کہ یہ نگو گجرات کا کوئی شہر ہوگا ' یوں ملتا ہے کہ
 ہاشم علی نے چند رقیبوں میں دکن کو اس طرح یاد کیا ہے کہ گویا وہ وہاں نہیں
 رہتے ۔ اس کے ہر خلاصہ گجرات میں رہنا حسب ذیل شعروں سے ثابت ہوتا ہے —

ہاشم علی لکھا توں بیکس دولہن کی باتاں

اس غم سے ہے جگر خون ' اور چشم اشک ریزاں

گجرات میں پڑے جب یہ مرثیہ کو یاراں

من کر چلے ہیں روتے دکھنی دکھن کوں اپنے ۔ مرثیہ نمبر ۲۲۷

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں دکھنی گجرات کو اکثر جایا کرتے اور وہاں
 کے شاعروں سے مستفید ہوتے تھے ' یہ بات صرت والی اورنگ آبادی ہی تک
 محدود نہیں تھی۔ ہاشم علی کے علاوہ ایک اور مشہور شاعر ' رضا ' نے بھی دکھنیوں
 کا اس بارے میں ذکر کیا ہے وہ اپنے ایک مشہور مرثیہ کے آخر میں لکھتے ہیں: —

نیں ہے طاقت تا کروں غم کا سوسیں سارا بیاں

تم کرد زاری شہاں کی آج اے پیر و دواں

آفریں مجھ کوں کہو اے شاعران و ذاکراں

کرنا ہوں اب بس سخن کوں ' آج ہے قاسم کا بیہ (بیاض)

اے ' رضا ' قاسم کے جلوہ کا بیاں کر توں تمام

تجہ کوں محشر میں شفیع ہوکر چہڑاویں گے امام

مرثیہ تجہ کن لکھا کر لے کئے ہمیں ہر کدام

لے کئے دکھنی دکھن کوں ' آج ہے قاسم کا بیہ

کہا تعجب ہے کہ ' والی ' نے اپنے انبیدی گجراتی دوست شاعروں کی یاد میں وہ

نظم لکھی ہو جو ان کے جدید مطبوعہ کیات میں موجود ہے اور جن سے ظاہر

ہوتا ہے کہ واقعی ' والی ' کے دل پر گجراتیوں نے اچھے نقوش ناثر چھوڑے تھے ۔

ہاشم علی کے حسب ذیل شعر سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے

شعر دکھن پہنچتے تھے —

ہاشم علی نے آگے مسدوں نے یو خیر دکھن سے ہوئے تیرے سخن کر بلا چلے
اور نہ صرف یہی 'دکن کے شاعروں سے ہاشم علی کو داد تحسین حاصل کر لے
کی بھی توقع رہتی تھی - وہ کہتے ہیں —

ہاشم علی صاحب نہیں یہ سرقیہ کوں سے کر تجہ پر خلیفہ قادر تحسین کرے دکھن میں
اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گجرات اور دکھن کے شاعروں میں
تعلقات بھی قائم تھے اور ایک جگہ کی خبریں دوسری جگہ پہنچ جایا کرتی تھیں -
چنانچہ ہاشم علی نے اپنے مرحوم دکھنی دوستوں کو جس طرح یاد کیا ہے اس کا ذکر
پہلے آچکا ہے وہ کہتے ہیں —

صاحب نہیں ہے ہاشم علی بے سخن یہ غم کا بیباں سن کے لرزے لگن
ہزار حیف نہیں شاعراں دکھن - ورومی و مرزا اوقدار نہیں (مرثیہ ۱۶۵)

(۳)

ہاشم علی صرف مرثیہ گو شاعر تھے اور غالباً پیشہ ور - انہوں نے سوائے
مرثیوں کے کسی اور صنف شاعری میں قلم نہیں اٹھایا - اور جس طرح دوسرے
شاعر اپنی مختلف نظموں کو ایک جا کر کے انہیں ایک دیوان کی شکل میں حروف
تہجی کے لحاظ سے ردیف وار مرتب کرتے ہیں ہاشم علی کو بھی اس کا شوق ہوتا ہے -
چنانچہ وہ اپنے قسم قسم کے مرثیوں کو ردیف وار جمع کر کے ایک جگہ میں نقل کرتے
ہیں اور اس مجموعے کا نام " دیوان حسینی " رکھتے ہیں - کیوں کہ وہ امام حسین
اور اُن کے ساتھیوں کے غم و الم پر مبنی ہے —

" و سہمی شدن این اوراق بہ دیوان حسینی "

کے تحت انہوں نے جو ۹ شعر لکھے ہیں ان کے آخری شعر یہ ہیں —

شاعراں نے شعر بولے گرچہ رنگیں دل کشا
اے عزیزاں یو سخن ہے اس دل بریاں کا
توں لکھا ہے کربلا کا یو بیاں ہاشم علی
ہے یو دیوان حسینی نام اس دیوان کا (مرثیہ نمبر ۲)
اس کے علاوہ اپنے صرف مرثیہ کو ہونے کی نسبت انہوں نے صاف صاف کئی
جگہ اعلان کر دیا ہے۔ چنانچہ بعض شعر ملاحظہ ہوں —

- ۱۔ ہاشم علی ہمیشہ ڈناخوان شاہ کا
جز مدح و مذہبت سخن اُس نے لکھا نہیں (مرثیہ نمبر ۱۳۹)
 - ۲۔ بجز مدح نین شعر ہاشم علی
کہو راستی کے سخن پر سلام (مرثیہ نمبر ۱۱۴)
 - ۳۔ شاعری میں یو مقرر ہے تجھ ہاشم علی
جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط (مرثیہ نمبر ۷۳)
- اور نہ صرف یہی، انہیں اپنے خالی مرثیہ کو ہونے پر فخر بھی تھا۔ ان کا
خیال تھا چونکہ وہ مرثیوں کے سوا کسی اور صنف شاعری سے اپنے قلم کو گذرہ نہیں
کرتے اس لئے شعر بھی اچھے لکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں —

- ۱۔ ہے سخن کون مدح آل مصطفیٰ میں ہر تری
یو سبب در ریز ہے ہاشم علی کی شاعری
قدر جوہر کوئی نجانے کا سوائے جوہری
- ۲۔ ہوں توں بلبل صفت ہاشم علی
صہدم میں مدح اولاد علی
جب تلک دیکھ گلستان جہاں (مرثیہ نمبر ۱۷۲)
- ۳۔ ہاشم علی کے شعر جو مدح امام ہے

ہر ایسے فنکار اور اس کی فصاحت کو ہے درود (مرثیہ نمبر ۷)

اچکن اگر کہو انہیں : اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں میرے شعروں میں کوئی نقص تو نہیں تو وہ یہ کہہ کر اس کی مدافعت کرنا چاہتے ہیں کہ میرا مقصد شعر و شاعری تو ہے نہیں ، وہ صرف مرقیہ کو ہوں ، ہولا ، جے ، نکتہ چینییوں کی کیا پروا ؟ ہالہہ لکھتے ہیں ۔

۱۔ ہوس نہیں شاعری یاراں مجھ سے مدعا زاری

۔ مہن میں گر خطا دیکھو کر۔۔۔ میتیں گناہست (مرثیہ نمبر ۱۸۶)

۴۔ شہر ہاشم علی کے تئیں یاراں

مدح ۷۰ منہ دیکھو خالص (۰ رثیہ نمبر ۷۱)

یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہاشم علی نے اپنے سرئیہ کو ہونے پر فخر اور فکرتہ جیلوں سے بے پروائی کا ذکر صرف اس لئے کیا کہ وہ اس ذریعے سے اپنے عیب چھپاتا چاہتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد ہی اس طرح کا تھا۔ وہ ایک ادنیٰ درجے کے پوشہ ور سرئیہ کو نہیں تھے۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے اس کی اہمیت اور حقیقت پر انہیں اعتقاد تھا۔ وہ اس کو اپنے مذہبی فرائض کا ایک جز سمجھتے تھے اور اس سے انہیں صرف دنیاوی منافع ہی کی امید نہیں تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے سرئیہ انہیں آل انبی کی نظاروں میں عزیز کر دیں گے اور ان کے ذریعے سے وہ اپنی دینی زندگی میں سرخرو رہیں گے۔

یہ صرف نوری توقعات ہی نہ تھیں۔ انہیں ان کوششوں کے پہل ہی ملنے لگے تھے۔ انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ شہدائے کربلا علیہم السلام ان کے سرٹیوں سے خوش ہیں اور یہ کہ ان بزرگوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار ہی کر دیا ہے۔ ان کے برادر ایمانی حافظ فضل الدین نے ۱۱۳۸ھ میں جو خواب دیکھا تھا اس کو خود ہاشم علیہی کے لفظوں میں ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے۔ لیکن اس طرح کے خوابوں کا ذکر ہاشم علی نے ایک سے زیادہ موقعوں پر کیا ہے۔ چنانچہ دیوان میں ردیف "کات" کو انہوں

نے ایک سلام سے شروع کیا ہے جس کی سرخی یہ لکھی ہے :-

” سلام الا (کذا) جناب سیدالہرسلین و اشارہ بایں کہ چون سابق در
عالم رویا جمال باکمال آنحضرت را دیدہ و آن خوابے است بسیار
طولانی - درین سلام تمنائے بار دیگر نمودہ و قسم حضرت شاہ کردہ
دادہ چنانچہ از فضل و کرم این آرزو برآمدہ و بار دیگر با حسن
و جہے مشاہدہ جناب اقدس نبوی نمودہ “ -

ایک اور مرثیے کی سرخی یہ ہے - اس میں ایک سے زیادہ خواب بیان کئے ہیں :-
” سلام الی جناب سیدالشہداء و دران اشارہ است بسہ خواب -
اول خواب است کہ جناب اقدس نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ را چنانچہ در سلام
ردیف الف اشارہ ہاں باشد —

دوم خوابے ست کہ جناب ولایت مآب علی مرتضیٰ و حضرت علی بن
موسیٰ ارضا علیہ التحیہ و اشارہ مشاہدہ نمودہ قدموس و
مصافحہ بجا آوردہ حضرت امیر بدست مبارک فکر باشارہ و بزبان
می فرمودن کہ علی بن موسیٰ -

وسوم خوابے است کہ مہب یکرنگ آل نبی امجد حاجی احمد درویش
حضرت سیدالشہداء را دیدہ و گویا این کہینہ نیز نزد حاضر بودہ
و ارشاد و ہمیلے شد کہ بجا آوردہ شد “ -

(مرثیہ نمبر ۸۹)

(اس میں بعض جگہ عبارت غلط ہے - میں نے حقی الامکان بعینہ نقل کر دیلے

کی کشش کی ہے) —

ان خوابوں کے علاوہ خود مرثیوں میں کئی شعر ایسے ہیں جو ظاہر کرتے
ہیں کہ ہاشم علی کس قدر خلوص اور اعتقاد کے ساتھ مرثیے لکھتے تھے - حسب
ذیل شعر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خود متاثر رہتے تھے —

کہاں تک، میں لکھوں اس غم کی ہا تاں

کہ دل کے جوشوں پر خوں ہیں انکھیاں (مرثیہ نمبر ۲۲۷)

آج ہاشم علی لکھا غم سوں

بہر کے انجھو لوہو میں سارے فین (مرثیہ نمبر ۱۵۲)

ہاشم علی کے سچے اعتقاد کا ثبوت اُن آرزوؤں سے بھی ملتا ہے جو انہوں نے

اپنے متعدد شعروں میں بیان کی ہیں مثلاً ایک جگہ وہ چاہتے ہیں کہ کربلا جاکر

خود مرقد امام علیہ السلام پر اپنے مرثیے سنائیں اور اس کی ان کو اس قدر تمنا

تھی کہ وہ اپنے کلام کا کربلا جانا افتہاے عروج و قبولیت سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں:-

بولاؤ ہاشم علی کون سرور نجاوے دل میں ید آرزو لے

کہ سارے جیتے یوم مرثیے ہیں پڑے تہارے وطن میں غم قہیں (مرثیہ ۱۵۴)

(۴)

(جتنے)

ہاشم علی لے آئے محباں نے یو خبر

دکھن سے ہو کے تیرے سخن کربلا چلے (مرثیہ ۲۲۵)

ان کی بعض دعاؤں اور خواہشوں کی نوعیت اور سنجیدگی ملاحظہ ہو:-

اے محباں التماس آمین کی تم سوں رکھتا یہ گنہ گار روسیا

یا حسین اے خامس آل عبا عرض ہیں گے پانچ مطلب اے شہا

اول ہے یو آرزو دل میں مدام لطف سوں اپنے زیارت کون بلا

دوسرا جب تئیں حیات مستعار رکھ مجھے بے منت خلق خدا

تیسرا ہونا قبول درگاہ یو سخن لکھنا مرا تیری ثنا

چار میں یہ حاضران و ذاکران تم سوں پاریں اپنے دل کی مدعا

ہے تچے مصلب شفاعت کا نصیب پانچواں سچ کون قیامت میں چھوڑا

وغیرہ (مرثیہ نمبر ۱۹)

ان کو امید تھی کہ قیامت کے دن امام حسینؑ ان کی شفاعت کر کے انہیں

جنت دلائیں گے :-

حشر کے دیوان میں جب نور چشم مصطفیٰ
 روضہ رضاں کوں بھیجیں گے کہاں کوں چھوڑا
 یاد کر ہاشم علی تجھ کوں کہیں روز جزا
 وہ ہمارا کمترین مداح شاعر کاں کیا (مرثیہ ۳۱)
 ایک اور شعر ملاحظہ ہو :

ہاشم علی کوں سرور گر لطف سے نوازیں
 نہیں ہے عجب عزیزاں ' ہے خاندان کرم کا (مرثیہ ۷)
 ہاشم علی نے پیشہ ور مرثیہ گو ہو نے کی بحث کے متعلق چند اور معلومات
 بھی حاصل ہوئی ہیں - ایک تو یہ کہ ان کے چند شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ
 وہ ہر سال باضابطہ طور پر مرثیے لکھتے تھے - چنانچہ کہتے ہیں —

تجہ کوں ہاشم علی حسین سرور
 ہر برس مرثیہ لکھاتے ہیں (مرثیہ ۱۴۹)
 لکھوں کہاں تلک میں بیان ستم
 مجھے ہر برس لے کے تھر قلم
 لگاتا رہا ہے کہاں دار غم
 جگر پر مرے تیر آخر نہیں (مرثیہ ۱۶۵)
 آخری مصرعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ مدت سے مرثیے لکھتے آئے ہیں اور یہ کہ
 جب تک زندہ رہیں گے انہیں ہر سال غم کرتے رہنا پڑے گا - ایک اور جگہ بھی
 انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے —

شعراں نے ہر کداسیں فوبت اس غم کی بھرے
 ہے تجھے ہاشم علی اس درد کی باری ہنوز

اس سے یہ مطلب ہوا کہ لا جا سکتا ہے کہ ہم عصر مرثیہ گو مرثیہ لکھتے لکھتے مرثیے لیکن ہاشم علی کی باری ادبی ختم نہیں ہوئی۔
 پوشہ و مرثیہ گوئی سے متعلقہ دوسری قسم کی معلومات بعض مرثیوں کے درمہانی اشاروں سے ہوتی ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہاشم علی نے صرف ملہر پر ہیغورہ کر پڑھنے ہی کے لئے مرثیہ نہیں لکھے بلکہ انہوں نے عام رسم و رواج کا بھی احاطہ رکھنا پڑا۔ زیارت اور چالیسویں کے فیوز الوداعی مرثیوں کے علاوہ (جو ملہروں اور تعزیوں کو تونہا کر کے واپس ہونے وقت پڑھے جاتے ہوں) تابوت لے جاتے وقت راستہ سے پڑھتے ہوئے جالے کے لئے بھی انہوں نے علامہ مرثیہ لکھے۔ چنانچہ مرثیہ نمبر ۱۵۵ اور ۱۶۹ 'دفعہ میں پچاس پچاس شعر لکھنے کے بعد یہ اشارہ کرتے ہیں کہ:—

”ازیں جا روہر وے تا بوت ایستادہ شدہ بخواند و آہستہ روانہ شواد“

- زیارت اور چالیسویں کے مرثیوں کی ابتدا میں حسب ذیل نوٹ لکھے ہیں۔
- ۱۔ ”درہماں روز سوم کہ در اصطلاح روز پودل و روز زیارت کو یند و این مرثیہ مخصوص آن روز است۔“
- ۲۔ مرثیہ چہام کہ با اصطلاح اہل ہند چالیسواں کو یند و مطلب امت دہ در آن روز یا شب خواندہ شود۔“

(۴)

ہاشم علی کے مجموعہ سرائی 'یعلے دیوان حسینی میں کل ۲۳۸ مرثیہ ہیں یہ ان کا مکمل دیوان نہیں ہے۔ کیونکہ کتب میں انہوں نے (خصوصاً ہر ردیف کے آخر میں) بہت سے صفحے خالی چھوڑ دیے گئے ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف اور سرقبہ نقل کرنا چاہتا تھا۔ بد قسمتی سے کتابت کی کوئی تاریخ نہیں ملتی۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی ہی میں یہ بیانی

لکھی گئی ہو گی —

ہاشم علی ایک اچھے مرثیہ گو تھے۔ اگرچہ 'رزا' غلامی' اور قادر کے بعض مرثیوں کے مقابلے کے 'دیوان حسینی' میں کوئی مرثیہ موجود نہیں ہے ' تاہم ہاشم علی کی استادی اور اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور بقول ان کے —

شعر ہاشم علی ہونے مشہور

نہیں ہے دیوان کی کتاب ہنوز (مرثیہ ۶۲)

کوئی تعجب نہیں اگر وہ 'دیوان حسینی' کے جمع ہونے سے پہلے ہی خاصے مشہور ہو چکے ہوں —

ان کی زندگی کی نوعیت پر 'افسوس' ہے کہ ان مرثیوں سے کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ایک دو جگہ ایسے شعر ضرور مل جاتے ہیں جن میں مصنف کے خیالات کی کچھ جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن وہ کوئی زندہ اہم نہیں۔ ذیل کے چند شعر ثابت کرتے ہیں کہ ہاشم علی کی زندگی عام انسانوں کی زندگی کی طرح صدوں سے آزاد نہیں تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہوتی اگر انہیں ٹھہر کر یہ لگتیں اور دنیا کی سرد سہریوں اور نیرنگیوں کی شکایت کرنے کا موقع ملتا —

۱ - ہاشم علی زمانہ میں سہر و وفا نہیں

دلہائے پر نفاق سے صدق و صدا نہیں

ہرگز نہیں سروت و شرم و حیا نہیں

اس درد کے دوا کوں بغیر از خدا نہیں

فریاد یا محمد و یاسر تضرعی علی (مرثیہ ۴۳)

۲ - زندگی دنیا کی ہے ہاشم علی خواب و خیال

جو رہا سو یار و چوکا ' جاگذا ہے گا کمال

ہے بعد کی نید بھاری آج تو اس کوں سہاں
تا جگا ویں صہم محترج کو آساں نید سوں

(مرثیہ ۹۵ بیاض)

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم علی کی
ہاشمی کے چلد نمونے بھی پیش کئے جائیں تاکہ ناظرین کو اس کے متعلق خو د
کوئی اندازہ قائم کرنے کا موقع ملے۔ ہاشم علی نے کربلا سے متعلق تقریباً ہر واقعے پر
مرثیہ لکھا ہے۔ لیکن یہاں صرف چار قسم کے مرثیوں کے انتخاب نقل کئے جاتے ہیں۔
۱۔ عام مرثیے (یعنی وہ مرثیے جن میں کربلا کے واقعے پر عام طور پر غم کیا گیا ہو
یا محرم کا آغاز بیان کیا ہو) ۲۔ امام حسین کے مرثیے۔ ۳۔ امام قاسم کے مرثیے
۴۔ امام زادہ علی اصغر کے مرثیے۔

۱۔ عام مرثیے کے چلد شعر :—

افسوس چو کدھن سین ٹپکتا لوہو لوہو
ہو کر شفیق گکن سین ٹپکتا لوہو لوہو
عالم کے سب ذہن سین ٹپکتا لوہو لوہو
سرور کھا کھی سین ٹپکتا لوہو لوہو

جس وقت اوپر شہید ہوا طفل خورد سال
سرور لے آئے کھر کوں تب اندوہ سین کمال
بانو کے سر سین ہوئی کھا دیکھ کے یو حال
اصغر کے پیرھی سین ٹپکتا لوہو لوہو

۲۔ عام مرثیے کا انتخاب :—

یہ موسم خزاں ہے کلہا نہیں کے سوکھ
اس دوکھ سوں آج ہلہل نالاں رہا چمن میں

پہاسا جگر ہے شہ کا دلہا میں آگ لاگی
 سب ہو لوہو پگھل کر بہتے چلے نہیں میں
 ماہ نہیں لوہو میں جب کر بلا میں توہا
 تارے فلک کے اوپر روتے ہیں سب رین میں
 یہ بوند ہے لوہو کی یا لعل بے بہا کا
 نکمہ ترے گلے پر ٹانکا ہے پیروہن میں
 فانوس میں گھونگٹہ کے مافند شمع گریاں
 ہے ہے رہی وہ دلیہں جلتے افس کے من میں

۳ - آغاز محرم :-

پھر کہتا ہوں غم کے بادل کی گگن پر آشکار
 کر بلا میں میگھ برسے لہو کی دھاراں بے شمار
 تیغ چمکے سراو پر بجلی کے مافن (مافند) بار بار
 کیا سہا ہے، ہے پڑا سارا جہاں میاںے اندھار
 یہ جھڑی دس دن لگے کی سہ غم ہا شور ہے
 کر بلا کی موج غم سوں دل کی ندیاں پور ہے
 نعرہ ہا کرکین گرج کر آج نفم صور ہے
 چو طرت کھن کھور ہے، لہو کی ہرستی ہے پھوہار

نہیں نکلتا ہے سورج - وئے تہیں سکھ کے بھڑن
 خون دل سوں جہاں تلک دیکھو ٹپکتی ہیں نہیں
 تر ہوئے ہیں اشکباری سوں، لرزتے ہیں بدن
 آہ کا ہر دم ہوا ہے کا دلوں سیتیں پوکار

۴ - آوازِ محرم -

دیکھو محرم ہلالِ ماتم ہوا نمایاں فلک میں غم تھیں (ہے)
 دلوں میں ندیاں لوہو کی بہتیں چلیں اوبل کر نین میں غم تھیں
 جھلکتے تارے نہیں فلک پر ' ملک ہیں گریاں فراق سیتھیں
 پڑی ہیں ہونداں انجھو نے سارے انکھیاں سے تھل تھل رہیں میں غم تھیں
 رہا ہے بابل یو دوکھ سوں فالان ' گلاں کھل کر پڑے زمیں پر
 وہ شہ کے سہرے کون پھولِ مالاں چوڑا ہے جب آچمن میں غم تھیں
 ہوا ہے چہرہ اوہو میں کل کون ' سو فید میاںے مکن ہیں انکھیاں
 پڑے ہیں گاؤں اوپر اولجھہ کر وہ زلف مشکیں شکن میں غم تھیں

۵ - شہادتِ حسین علیہ السلام پر حضرت فاطمہ کا ماتم -

آیا محرم اورتا دھولا را روتا ہے عالم اس غم میں سارا
 خیرالنسا لے تب یوں پکارا میرا حسینا نا حق مارا
 ہے ہے حسینا تیری جوانی! تھا قطب تارا تیری پیشانی
 دو جانہیں تھا کوئی جگ میں ثانی میرا حسینا نا حق مارا
 جب تشنگی سوں توں تھلایا اتوں سندر تب کھل بلایا
 انہیں ظالماں لے پانی پلایا میرا حسینا نا حق مارا
 توں مرہی کا تھا روشن ستارا تیرا شرف تھا سب آشکارا
 ہے آج تیرا سرتن سوں نیارا میرا حسینا نا حق مارا

۶ - امامِ قاسم اور ہی بی سکنہ کی شادی ہوتی ہے ۔ ابھی دولہا دکھیں
 برابر باہت چیت بوی نہیں کرنے پاتا ہے کہ جنگ میں جانا پڑتا ہے ۔ ایسے نازک
 وقت میں دولہا دلہن میں جو گفتگو ہوتی ہے اس کا ہاشم علی نے ایک سرٹھے میں

بیان کیا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں: —

جلوہ میں اوٹھ کے رن کوں چلا تب کہی دلوں
 دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے فین
 مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہم
 تم بن رہے گا ہاے یہ سونا بھون مرا
 کیسی یو کدخدائی و کیسی ہے یو برات
 آتا فراق تم سوں یو جلوہ کے آج رات
 گھر کوں نہ لے گئے ہو نہ بولے ہو ہم سوں بات
 دیکھا نہیں جمال کوں بھر کے فین مرا
 اس کربلا کے بن مہن اکیلی میں کیوں رہوں
 تجھ باج میں جہاں میں پور امید کیا دھروں
 جد کے مدینہ کہوں کہ میں اس تھار سے پھروں
 تم اپنے ساتھ ایکے دکھاؤ وطن مرا
 جاتے ہو چھوڑ رن کی طرت مجھ کوں تم رولا
 نہیں شرم کا ہنوز یہ سوں گھونگٹھہ کھولا
 کرتے نہیں محبت و جاتے میا بھولا
 اس زندگی سوں آج بھلا ہے مرن مرا
 شعلہ لگا ہے دل منے اس غم کا کیا کروں
 مجھ کوں روا روا ہے اگر زہر کھا مروں
 دوری میں ہاے تیرے میں دن دن کہوں بہروں
 فرقت کی آگ سیتیں جلے گا بدن مرا

قاسم کھڑا تھا روتے نہیں سن دولہن کی بات
 ہم ناک اپنا دیکھ کے دامن دولہن کے ہات
 تب آہ دردناک سوں بولا دولہن کے سات
 اے ہوستاں راحہ و سرو چمن مرا
 سچ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار
 تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار
 میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار
 حق نے کیا ہے رن میں مقرر رہن مرا
 ہے داغ دل میں بیروں جدائی کا ، کیا کروں
 نہیں ہے امید رن سے پھر آکر تجھے ملوں
 جو کچھ ہوا مقدروں میں راستی کہوں
 وعدہ ہوا ہے حشر میں تم سوں ملن مرا

۷۔ حضرت شہر بانو امام زادہ اصغر کا ماتم کرتی ہیں —

آج پر خون کفن ترا اصغر آج سوکھا دھن ترا اصغر
 لال ہے گلبدن ترا اصغر حیف یو بالین ترا اصغر
 کیوں ہیں زلفاں کے بال تاروں تار کیوں گلے سے لڑھو کے جاری دھار
 تج کوں سوتے کبھو نہ لگتی بار حیف یو بالین ترا اصغر
 اوتھہ گلے کا لڑھو نہ ہلاؤں میں نیدآتی تجھے سولاؤں میں
 چل ترا پالنا جھولاؤں میں حیف یو بالین ترا اصغر
 کیوں جہا سبہ ستیں کٹے تج کوں پھر میں گودی لٹے پھروں کس کوں
 کیوں نہ لاکے بلا تری سچ کوں حیف یو بالین ترا اصغر
 اللہ اللہ کیا تجھے پالا من میں یوں تھا کروں گی بسم اللہ

ہاے ترا گیا جیا بالا حیف یو بالپن ترا اصغر

کس کا اب پالنا جھولاؤں کی لولی دے کے سولاؤں کی
کس کوں چھاتی ستیں لگاؤں کی حیف یو بالپن ترا اصغر

۸۔ ماتم امام زادہ اصغر - حضرت شہربانو کہتی ہیں :-

کہتی ہیں بانو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا
بالے اصغر باج میں کس کا جھولاؤں پالنا
سویا ہے گردن دال کیوں اولجھ زلف کے بال کیوں
رنگیں لودھو سین گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا
توں کھول انکھیاں سین دیکھوں، توں بول ہتیاں میں سنوں
روتا نہیں توں کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا
تھ کھیلنے کے دن ترے، کیا عہر، کیا تھ سن ترے
نہیں چین سچ کوں بن ترے کس کا جھولاؤں پالنا
یہ بہن تیری غمگسار بھٹی ہے روتی زار زار
توں اوٹھ سکھدا کر پکار کس کا جھولاؤں پالنا
کیاں (کہاں) سین اجل تھی گہات میں گئی لے کے تجھ کوں ہات میں
بالا گیا جی بات میں کس کا جھولاؤں پالنا
اے مہرے پیارے لاتالے! پھر آئے لگ توں مجھ گلے
انجھو نین سین بہہ چلے کس کا جھولاؤں پالنا

۹۔ حضرت شہربانو کا ماتم علی اصغر کی شہادت پر :-

بالے اصغر کے تئیں بلاتی رہی سونا یہ پالنا جھولاتی رہی
جھولا تیرا پڑا رہا خالی دوری مجھ ہات میں ہلاتی رہی

ہاے کیوں روٹوہ کر گیا مجھ سے
 بھول کیوں توں چلا گیا میری
 میں سولاتی تھی جب لگا چھاتی
 رات دن میں کہو نہ دی رولے
 تھا برس کا نٹھہ کا تجھے ارماں
 قاسم آیا ہے جب بھیانکے کوں
 لہو بھرا کیوں ترا چندر مکہ ہے
 دودھ پیتا سرا کیا بالے
 تج کوں بھاتی نہ تھی اندھاوی رات
 کر کے تعویذ دل اوپر رکھتی
 کیوں نہ آخر ہوئی صبر میری
 مہرے پیارے کے تئیں مناتی رہی
 آدے اصغر تجھے بولاتی رہی
 آنھل اپنا تجھے اور جاتی رہی
 کر کے باتاں تجھے ہنساتی رہی
 لال جاماں ترا سلاتی رہی
 میں تماشا تجھے دکھاتی رہی
 جس کوں ہاتھوں سے میں دھلاتی رہی
 غم سوں چھاتی سوں بھراتی رہی
 تیری خاطر دیوا جلاتی رہی
 بد نظر سین تجھے چھپاتی رہی
 تجھے بنا حیف مجھ حیات رہی

(۵)

جن جن شاعروں کے مرثیے اس کتب خانے کی ”بیاض مرثی“ میں موجود ہیں
 اُن کی فہرست، حروف تہجی کے لحاظ سے، اُن کے مرثیوں اور اشعار کی تعداد کے ساتھ
 یہاں درج کی جاتی ہے: —

شمار	تخلص	تعداد مرثی	تعداد جملہ اشعار
۱	احمد	۷	۱۵۷
۲	اعتر	۱۳	۱۳۵
۳	اصغر	۱	۲۴
۴	افصم	۲	۲۹
۵	افضل	۱	۳۵ (۷ بلند مخمس)
۶	اکبری	۱	۱۸
۷	القی	۱	۱۱

شمار	تخلص	تعداد سرائی	تعداد جملہ اشعار
۸	اماسی	۸	۶۹ شعور ۳۳ - صرفے (۱۱ بلد - ملکہ)
۹	باقر	۱	۲۲
۱۰	برہی	۱	۹
۱۱	بے خبر	۲	۱۸
۱۲	قرباب	۵	۴۹
۱۳	تقی	۲	۶۸
۱۴	حمیدی	۱	۱۲
۱۵	داس	۸	۱۹۶
۱۶	ذوقی	۱۱	۱۴۲
۱۷	رضا	۱۵	۳۵۴
۱۸	رضی	۹	۸۷
۱۹	رمضانی	۴	۵۵
۲۰	روحی	۵	۴۹
۲۱	سرور	۱	۱۷
۲۲	سری	۲	۱۹
۲۳	سیمیں	۲	۱۹
۲۴	سید	۹	۱۱۲
۲۵	سید مصد (۹)	۱	۱۴
۲۶	سیمن	۲	۱۸
۲۷	شرف	۴	۸۷
۲۸	شہابی	۱	۱۴
۲۹	شہی (شاہی)	۲	۲۹

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۳۰	شیدا	۱	۱۸
۳۱	صابر	۱	۲۰ مصرعے (۱۰ بند مخمس)
۳۲	صالح	۲	۲۴
۳۳	صلاح	۸	۱۲۱
۳۴	صوفی	۱	۱۲
۳۵	طاہر	۶	۱۶۸
۳۶	طفیل	۱	۱۱
۳۷	مابد	۱	۱۱
۳۸	عارف	۲	۲۹
۳۹	عزت (۹)	۱	۷
۴۰	ہزت	۱	۴۴
۴۱	عزالت	۸	۲۰۵
۴۲	عطا	۱	۱۷
۴۳	عطائی	۱	۱۰
۴۴	ہنلیم	۱	۴۵
۴۵	علی	۱	(۹)
۴۶	میں الدین توحید (۹)	۱	۲۴
۴۷	فالب	۱	۱۲
۴۸	غلام	۱	۲۷
۴۹	غلامی	۱۷	۳۷۳
۵۰	فائز	۱	۵۱
۵۱	فتح	۱	۲۸

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۵۲	فضل	۲	۳۸
۵۳	قادر	۱۷	۳۰۵
۵۴	قائم	۳	۷۹
۵۵	قربان ہلی	۳	۴۰
۵۶	قطب ابن حسن	۴	۵۴
۵۷	کاظم	۱۰	۲۰۴
۵۸	گل	۲	۲۱
۵۹	مہتلا	۱	۱۱
۶۰	مرزا	۱۵	۲۰۵ شعر ۲۰ مصرعے
۶۱	مسکین	۱	۱۱
۶۲	مسیحا	۱	۲۶
۶۳	مسلم الدین	۲	۱۸
۶۴	موالی	۱	۹۴
۶۵	موسی	۱	۶۳
۶۶	معتبر خان عمر	۱	۲۵ مصرعے (۵ ہند مخمس)
۶۷	مکھن	۱	۱۳
۶۸	ندا	۴	۳۹
۶۹	ندیم	۱۱	۱۵۲
۷۰	نظور	۴	۱۲۴
۷۱	نعمیم	۱	۷
۷۲	ولی	۳	۲۸
۷۳	ہالی	۱	۴۳

شمار	تخلص	تعداد مراثی	تعداد جملہ اشعار
۷۴	ہاشم (۹)	۱	۲۰
۷۵	ہاشم علی	۲	۴۴
۷۶	ہاشمی	۱	۱۰
۷۷	ہوشدار	۳	۸۸
۷۸	یاری	۲	۲۳
۷۹	یوسف	۲	۵۶
۸۰	نامعلوم شعرا	۷	۸۳ شعر ۶۵ مصرعے



کبیر

از

(جناب محمد حفیظ سید صاحب ہی - اے - ہی ٹی لکچرار اُردو، الہ آباد یونیورسٹی)

روایت ہے کہ کبیر نے پچاس سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں۔ لیکن ان میں اکثر اصلی نہیں ہیں اور باقیوں میں سے بھی بہت سی ایسی ہیں جو ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی ہیں۔ ”خاص گرفتہ“ جس کی نسبت دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کبیر کے اشعار کا مکمل مجموعہ ہے، فی الحقیقت اکیس دیوانوں پر مشتمل ہے۔ مگر ان میں سے چند ہی ایسے دیوان نکلیں گے جو تحقیق اور چھان بین کے معیار پر صحیح اُتر سکیں۔ ”کبیر ساگر“ یا ”بدھ ساگر“ کی ضخیم جلدوں کے مطالعے نے جسے زمانہ حال کے مشہور کبیر پلٹھی مصنف ’سوامی یوگالاند‘ نے ترتیب دیا ہے اور ونگٹیشور پریس (بمبئی) نے شائع کیا ہے، اس فیور محققانہ سادگی پر استعجاب ہوتا ہے جو علم ادب کے ایسے مختلف مجموعے کو ایک ہی زیر دست دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن جہاں اندرونی شہادت کی بنا پر بسا اوقات بہت سی نظموں کو بے اصل سمجھ کر مسترد کر دیا جاتا ہے، وہاں یہ امر بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ باقی دواوین کے ہر بند کی صحت پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لیا جائے۔ بیابان تیر پریس (الہ آباد)

کے شائع کردہ ”ساکھوں“ اور ”شبدوں“ کے ایڈیٹروں نے قطع و برید، ترسیم و تنسیخ میں جس احتیاط اور محنت سے کام کیا ہے اسے دیکھ کر خواہ مخواہ دل سے داد نکلتی ہے۔ لیکن انہوں نے تمباکو کی مذمت کے بند کو بھی شامل کر لیا ہے، حالانکہ اس کا رواج ہندوستان میں کبیر کی وفات کے کئی برس بعد ہوا۔ بہر حال جہاں تک باقی نظموں کا تعلق ہے اس سب سے کبیر کی شاعرانہ زبان طرز بہان، جذبات اور جوش کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ چند شاکردوں نے جو اپنے آقا اور استاد کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور شاعرانہ نغمہ سنجیوں سے پورے طور پر بہرہ اندوز تھے، جوہی عقیدت کے سبب اپنے نتائج فکر کو اس سے منسوب کر دیا۔ ثانیاً ہر چھوٹے سے چھوٹے فرقے کے حامیوں نے جس میں کبیر پنتھو منقسم ہو گئے ہیں، اپنے مخصوص عقائد کو بالیہ فرقہ سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ثالثاً زمانہ مابعد کے شعرا نے بجائے انفرادی طور پر شہرت حاصل کرنے کے اس دور کے طرز میں لکھنا زیادہ مناسب سمجھا اور جو کچھ لکھا اسے اپنے استاد کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سولہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کلام کبیر کے جتنے جاسع، ایڈیٹر اور شارحین گزرے ہیں وہ سب کے سب تمام مجہوہے کو کلام الہی سمجھتے تھے اور اس پر تلقین نواز ڈالے بغیر اس کے ساتھ اظہار عقیدت کرتے تھے۔

بہر حال یہ انتخاب ایسا ہے جس پر کبیر کی اعلیٰ ذہانت و قابلیت کا نہ صرف ناقابل تردید نشان موجود ہے بلکہ اس میں ربط و تسلسل اور جامعیت بھی پائی جاتی ہے اور یہ وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے یقین ہوتا ہے کہ وہ جعل یا تعریف سے بالکل پاک و سبوا ہے۔ اس کا نام ”بھجک“ ہے اور وہ ہندی تصانیف میں زبان زہ خاص و عام بھی ہے۔

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن موجود ہیں، جو یا تو اصل کتاب کے اقتباسات

ہیں یا اس کے مکمل نسخے ہیں۔ ان کا مقام طباعت بنارس (سنہ ۱۸۶۸ ع) کلکتہ (سنہ ۱۸۹۰ ع) 'لکھنؤ' (سنہ ۱۸۹۸ ع) 'الہ آباد' (سنہ ۱۹۰۵ ع) اور بمبئی (سنہ ۱۹۰۶ ع) اور ہمیرپور (سنہ ۱۹۰۸ ع) ہے۔ 'آدی گرتھ' جو سکھوں کی مقدس کتاب ہے، بہت سے ایسے کیتوں اور اقوال پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر صحیح طور پر کبیر سے منسوب کئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کبیر کے عقائد اور ان کی تعلیمات یا تو زیادہ تر "بیجک" میں ملیں گی یا ثانیاً آدی گرتھ میں (مگر بڑی احتیاط کے ساتھ) یا 'ساکھوں' کے 'بیلوے دیور' والے ایڈیشنوں سے اخذ کی جائیں گی۔ شہد 'اکھراواتی' اور 'گیان کوداری' ریختے جھلنے وغیرہ بھی جنہیں الہ آباد کے پریس نے شائع کیا ہے، اس قدر غیر مصدقہ ہیں کہ ان پر بالکل اعتماد نہیں کیا جاسکتا —

اسی طرح جو دوہے یا گیت وغیرہ کبیر کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں وہ نقادانہ تشریح کے سامنے بالکل بے وقعت رہ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں از ملہ وسطیٰ میں کبیر کے کلام پر جو شرحیں لکھی گئی ہیں، وہ محض ناکارہ ہیں۔ بالعموم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرقہ دارانہ جذبات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں، جو بسا اوقات نہ صرف مبہم ہیں بلکہ گمراہ کن بھی ثابت ہوئی ہیں۔ مثلاً پاکھند کھنڈینی کی شرح کو لیجئے، جس کی نسبت روایت ہے کہ وہ 'سہاراجہ وشواناتھ سنگھ' والی ریوا کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ شرح آسان سے آسان اور سادہ سے سادہ متن کی عبارت کو بوی مہمل اور گنجلیک بنادیتی ہے۔ ہمیں امید تھی کہ سولہویں صدی کے فاسور سورخ اور مذاہب مختلفہ کے نقاد یعنی 'ابوالفضل' کی تحریروں سے کچھ امداد ملیگی مگر وہ بھی تھیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں ان کا ذکر کر کے چپ ہو جاتا ہے۔ 'دہستان مذاہب' بھی کوئی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئی * —

موجودہ دور میں جن لوگوں نے کبیر کی زندگی اور تعلیمات کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے ان میں سب سے پہلا نام ایچ ' ایچ ' ولسن کا ہے جو مستشرقین کی فہرست میں بہت شہرت رکھتے ہیں ۔ جن باتوں نے ان کی شہرت میں چار چاند لگائے ہیں ان میں سے ایک اس امر کا تسلیم کر لینا خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ ہندو مذہب اور تہذیب و تمدن کے مطالعے میں از سنہ وسطیٰ کا علم ادب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد خود بخود بہت سے یورپین اہل قلم نے جن میں گارسن دی تاسی کا نام زیادہ مشہور ہے ' " کبیر اور کبیر پنتھی " کے شائع ہونے کے زمانے تک جس کی ترتیب کا سہرا ایک مشہور مذہبی لیڈر کے صاحبِ زادے ریورنڈ جی ' ایچ ' ویسٹ کات کے سر رہیگا ' دلچسپی ظاہر کرنی شروع کر دی۔ انہوں نے اس مصلح کی زندگی اور تعلیمات پر اپنے خیالات پیش کرنے کے علاوہ ان کی بعض تصانیف کے حصوں کا ترجمہ بھی شائع کیا ہے ۔ اور اُن کے مذہب کے بارے میں اپنی ذاتی تحقیقات کے نتائج بھی پیش کئے ہیں ۔ بشپ ویسٹ کات کے بعض خیالات اور نتائج سے " اجودھیا سنگھ اپادھیائے " نے اپنے " منتخبات کبیر " کے طویل اور فاضلانہ مقدمے میں اختلاف کیا ہے۔ منہاتھ ناتھ دت نے اپنی تصنیف " انبیائے ہند " میں کبیر کا ذکر کیا ہے۔ اور منوہر لعل زتشی نے بھی اپنے سلسلہ مضامین " ہندو پروٹسٹنٹزم " میں کبیر کے متعلق قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سر ولیم ہنٹر اور دوسرے مصنفین نے بھی اپنی اپنی تاریخوں میں مختصراً کبیر کا ذکر کیا ہے ۔ سی ' ایف ' اینڈریوز نے بھی کبیر کے ارشادات اور شاعری پر ہم تاریخی تبصرے کے ضمن میں بحث کی ہے ۔ اسی طرح مگر کم کامیابی کے ساتھ جے ' این ' فارکور نے بھی کوشش کی ہے۔ مصر برادران نے زیادہ تر اس کے ادبی پہلو سے بحث کی ہے۔ اور ریورنڈ احمد شاہ نے اپنے بیجک کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں زیادہ تر اس معلم روحانی کی مذہبی و اخلاقی اور تاریخی حیثیت کو اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ سر جارج گریسن نے اس پر اور بشپ ویسٹ کات کی تصنیف پر ریویو کے دوران

میں نیز اپنی کتاب ” مادرن ورنیکلو لٹریچر “ میں مضمون زیر بحث کے سوانحی ، ادبی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ کبیرو کے ترجمہ کلام پر جسے رابندراناتھ ٹیگور نے انگریزی کا جامہ پہلایا ہے ، ” ایولن انڈرہل نے اپنے دیباچے میں ” کرو کے تصوت سے بحث کی ہے جو حسب توقع نہایت دلچسپ ہے ۔ یہ تمام تنقیدیں ہمدردانہ انداز میں لکھی گئی ہیں اور آریا سماج فرقے کے باقی سوامی دیانند سر-وتی اور دوسرے کم درجے کے مذہبی مصنفین کی کم عالمانہ ، غیر محققانہ اور غیر فیاضانہ تحریروں کے مقابلے میں دلچسپ تضاد پیش کرتی ہیں ۔

ہمارے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسے کبیر پنتھیوں کی ان بے شمار مگر مختصر غیر تنقیدانہ تحریروں کی طرف کچھہ اعتنا کریں ، جو ہمارے علم اور معلومات میں کچھہ زیادہ اضافہ نہیں کرتیں ۔

قبل یا مابعد کے کسی مصاح کے کلام اور تعلیم کی جانب اس قدر توجہ نہیں کی گئی ، جنہی کبیر کے کلام اور تعلیم کی طرف کی گئی ہے اور اس کے بعد اس کے مستحق تھے ۔ لیکن باوجود اس کے ان کی شخصیت طرح طرح کے ارہام ، توہمات اور قصص کے گرد و غبار میں چھپی ہوئی ہے ۔ ان کی طرز تحریر گنجلک ہو کر رہ جاتی ہے ، ان کے سہمے لایدل رہ جاتے ہیں ، اور ان کو معنی کا لباس پہنانا بسا اوقات نہایت مشکل ہو جاتا ہے ۔ مگر ان باتوں کے باوجود از منہ و سطح کے مذہبی پیشواؤں ، مصلحوں اور شاعروں پر ان کا بہت بڑا اثر تھا اور ان کی کامیابی اور ناکامی کا راز اس قدر زیادہ دلچسپ ہے کہ ان کی زندگی ، ان کی تعلیمات ، ہندوستانی فلسفہ اور ہندو مذہب پر نظر ثانی اور ہندی شاعری کی تاریخ میں ان کے درجے کے متعلق بحث کی گنجائش ہمیشہ باقی رہیگی ۔

روایتاً مشہور ہے کہ سنہ ۳۵۵ء وکرمی میں کبیر بنارس میں ماہر تارا تالاب

کے ادھر روشنی کی چمک کے ساتھ بطور معجزے کے خود بخود ظہور میں آئے تھے۔
 یا یہ کہ رامانند کی دعا کے اثر سے وہ ایک اچھوتی برہمن بیوہ کے بطن سے پیدا
 ہوئے تھے۔ یا یہ کہ بیوہ نے اپنے آپ کو لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچانے کی خاطر
 بچے کو قلاب کے قریب ڈال دیا تھا۔ وہاں سے انہیں ایک نئے نئے شادی شدہ مسلمان
 جلاھے 'نیرو' اور اس کی بیوی 'نیما' نے اٹھا لیا اور متبنی کر کے پال لیا۔ جتنے
 قاضی نام رہائے گئے اُن کے لائے گئے تھے انہوں نے قرآن مجید کے اوراق بار بار اُٹھ کر
 انہیں صرف اکبر، کبیر، کبریا، حق، وغیرہ نام ملے جو اسماء الہی ہیں
 داخل ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے بچے کو قتل کر دینے کا دستور دیا لیکن نیرو نے ان
 اسماء الہی سے یہ مطالب نکالا کہ یہ وہی خود بزرگ ترین ذات ہے اور دنیا میں
 سچے نلام ذکر چار کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد بچے کا نام کبیر رکھا
 گیا اور اگرچہ انہوں نے اسلامی گورنر میں تعلیم پائی تاہم خدا کی عبادت وہ
 رام نام ہی چپ کر رہے تھے۔ ان سے بسا اوقات بہت سو کراستیں ظہور میں آئیں،
 مثلاً جو حجام ان کا ختنہ کرنے کی لئے آتا وہ در کے سارے بھاگ جاتا۔ وہ بیماروں
 کو شفا بخش دیتے تھے اور ذبح شدہ گائے کو پھر از سر نو زندہ کر دیتے تھے۔ بار بار
 یہ طعنہ سن کر کہ وہ بے پیرے ہیں انہوں نے رامانند جی کا چیلہ بننے کا تہیہ
 کر لیا۔ لیکن وہ مفروضہ اسلامی نژاد ہونے کی بنا پر مسترد کر دیے گئے۔ بہر حال
 وہ اس طرح سے مسترد کر دیے جانے سے گھبرائے نہیں۔ بلکہ انہوں نے ایک چال چلی
 اور وہ یہ تھی کہ وہ چھوٹے بچے کا روپ لے کر رامانند جی کے راستے میں لیت گئے،
 گنگا جی کو جاتے ہوئے جب کبیر کے جسم کو رامانند جی کی کھڑاویں لگیں تو وہ
 لگے چلائے مگر رامانند جی نے انہیں چپ کیا اور آہستہ سے سر پر ہاتھ رکھ کر
 کہا کہ "کھورام رام"۔ "میرے آقا! تو کیا میں رام نام جیوں؟" رامانند جی
 نے فرمایا کہ "ہاں، رام نام جیو"۔ کبیر نے اُسے اپنی بیعت قرار دیا اور اسے
 علانیہ شہرت دی۔ میرت زدہ پھر نے جب وشنوجی کے پرستاروں کے طعنے سنے

تو صاف انکار کر دیا کہ میں نے کسی مسلمان جلائے کو اپنا مرید نہیں بنایا - لیکن بعد میں ان کا دل ہسیم کیا اور انہوں نے کبیر کو اپنے روحانی حلقے کا باقاعدہ رکن بنالیا اور بالآخر اپنے ۱۳۸۴ مریدوں کا خلیفہ مقرر کر دیا

بہت عرصے تک کبیر اپنی آبائی تجارت میں مشغول رہے - متعدد بار انہوں نے اس کپڑے کو خیرات میں دیدیا جسے وہ بغرض فروخت منقہ میں لے جاتے تھے - لیکن پرمیشور کے مافوق الادراک توسط کی بدولت تجارت میں الٹا سوگنا نفع ہوا - روکیوں کے روگ اور دکھیوں کے دکھ کو وہ کہو دیتے تھے، مردوں کو جلا دیتے تھے - عناصر وار بعد پر انہیں پورا قابو حاصل تھا، وہ بے رو رعایت سختی کے ساتھ مولویوں اور پروہتوں کی مذمت کرتے تھے اور اپنے عقائد کا دھڑلے کے ساتھ پرچار کرتے تھے - انہوں نے رابے 'داس' جہاں گشت سنا، اور سردانند اور سب سے بڑھکر اس دور کے مشہور و نامور دروہی اور صوفی گورکھ ناتھ کو نہ صرف مباحثوں میں بلکہ کرامتوں کے مقابلے میں فیچھا دکھادیا - انہوں نے اپنے پیرو کو دوبارہ زندہ کر دیا، جب کہ وہ سلطان سکندر والی دہلی کے حکم سے اس سے ملاقات نہ کرنے کے جوم میں قتل کر دئے گئے تھے اور ساتھ ہی انہیں شدید جسمانی اذیت سے بھی نجات دلائی - کبیر نے سلطان دہلی کو بھی قریب قریب اپنی طرف مائل کر لیا تھا، لیکن وہ پندتوں اور مولویوں کی جن میں شیخ تقی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے (ابن فریبیوں کے باعث ان کا شدید ترین دشمن بن گیا - مگر سب کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نہ تو آگ انہیں جلا سکی اور نہ پانی انہیں تہو سکا اور نہ خون خوار درندے اور تیز دھار کے فولادی ہتھیار ہی انہیں کوئی اذیت پہنچانے میں کامیاب ہو سکے -

اسی اثنا میں تقریباً تیس برس کی عمر میں کبیر نے ایک عورت لوئی ناسی کو جو ان کی مرید تھی، اور ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتی تھی اپنے پاک گھر میں داخل کر لیا - اسے ایک سادہ ہونے عالم طفولیت میں، دریائے گنگا میں، کھل میں لپٹا ہوا پایا تھا - جب وہ آئی تو تین مہینے کا ایک لڑکا، کمال، ناسی اس کی

حفاظت و - پردہ کی میں دیدیا گیا - یہ اڑکا بوی دریا پر تھرتا ہوا پایا گیا تھا اور اسے بوی تھی کے کہنے پر کمپیر نے زندہ کیا تھا - کھائی کو بھی جو پڑوسن کی فوجواں لڑکی تھی - کمپیر ہی نے اپنی کواست کے درمیان زندہ کیا تھا - کھر کے لوگ مصلحت مزدوری سے معمولی روزی کھالیا کرتے تھے - لہکن جوں جوں روحانی مہمانوں کا اضافہ ہوتا گیا ، فائمانہ طور پر ان کی امداد ہوتی گئی - کمپیر کی شہرت اب دور دراز مقامات تک پہنچ گئی ، حتیٰ کہ سکھ فرقے کے بانی بابا نانک نے بھی ان کی مریدی اختیار کر لی -

بڑے بڑے راجہ ان سے دعا کے طالب ہوتے تھے ، انہیں میں کجرات کے - سولنکی خاندان کا راجہ بھی تھا ، جس کے شیر جیسے چہرے والے بیٹے نے ریا کے باکھل خاندان کی بلیاں ڈالی - کمپیر نے ہندوستان کی سرحد کے پرے باخ اور بھارا تک سیاحت کی ، دو اُس زمانے میں علوم و فنون کے بہت بڑے مرکز تھے - دوران سفر میں ان سے بہت سی کراستیں ظہور میں آئیں اور جہاں جہاں ان سے مناظرے ہوئے ، وہ ان صب میں فتم مند رہے - اور اس طرح سے انہوں نے معرفت کی روشنی پھیلانی -

حب ان کی صبر ۱۲۰ کے قریب ہوگئی تو کمپیر نے دیدہ و دانستہ بنارس کو خیرباد کہا ، حالانکہ اس مقدس شہر کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ اگر وہاں موت واقع ہو جائے تو انسان سیدھا سورگ پہنچ جاتا ہے - بنارس سے وہ خلع بستی کے ایک گاؤں مکھڑ میں آئے ، جس کے متعلق یہ عام اعتقاد ہے کہ اگر کوئی انسان وہاں مرجاتا ہے تو پھر وہ یقینی طور پر دوسرے جنم میں گدھے کی جوں میں آتا ہے - ہندوؤں اور مسلمانوں میں ان کی لاش کے متعلق تنازعہ ہوا اور قریب تھا کہ جنگ و جدل کی فوج پہنچ جائے کہ اقلے میں کمپیر ظاہر ہوگئے اور لوگوں کو حکم دیا کہ دیکھو کھن کے نیچے کیا ہے ؟ - دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں تو پیواروں کا تھیر پڑا ہے - نصف پھول مسلمانوں نے دفن کر دیے اور باقی نصف کو ہندوؤں نے جلا ڈالا - کمپیر کی رفیق زندگی لوئی غالباً کمپیر سے قبل ہی وفات پاچکی تھی - کھالی کی کمی

برہمن سے شادی کردی گئی تھی۔ کمال ناخلاف نکلا اور اس اٹے روحانی بہمت کا سلسلہ دھرم داس نے قائم و برقرار رکھا جو سب سریدوں کے خلیفہ تھے اور تاجر پیشہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

کبیر جو ایک غریب گمنام مسلمان جلا ہے 'نیرو' کے فرزند تھے اور 'نیما' کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ' سنہ ۱۳۹۸ ع میں یا اس کے لگ بھگ بنارس میں تولد ہوئے تھے۔ ان کا باقاعدہ ختنہ ہوا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت ان کے وطن کے افراد کے مانند ہوئی تھی۔ وہ صوفیوں اور فقرا سے حسن عقیدت رکھتے تھے اور بالعموم یہ وہ لوگ ہوا کرتے تھے جو اس پاک شہر میں جس سے کبیر کی قسمت وابستہ تھی ' کچھ دنوں کے لئے آکر اقامت گزریں ہو جایا کرتے تھے۔ یہ اسلامی روایت کہ ' شیخ تقی کا کبیر کی شخصیت کی نشو و نما پر بہت گہرا اثر پڑا تھا ' غالباً صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کبیر بالآخر رامانند کے چیلوں میں داخل ہو گئے تھے اور اس کاروائی میں انہیں یقیناً خاص مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا۔ انہیں خدا پر نہایت زبردست اعتقاد تھا اور قرآن اور وید دونوں کو تسلیم کر لے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ پیر پرستی سے وہ سخت بیزار تھے اور انہوں نے ظاہری رسوم اور عبادت کو بھی یک قام موقوف کر دیا تھا۔

وہ خالص رہبانیت کو مکمل روحانی زندگی کا جز و خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی ملہمانہ شاعری کے جوش و خروش سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ انہیں اپنی بیوی لوئی سے غایت درجہ ہمدردی تھی۔ ان کی روز افزوں شہرت اور اثر ' ان کے مواعظ اور عتاب آمیز کلمات کے باعث ملا اور پندت ان کے سخت دشمن ہو گئے تھے اور ہر وقت ان کی ایذا رسانی کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ انہوں نے سلطان سکندر لودھی (سنہ ۱۳۸۸ م تا ۱۴۱۸ ع) جیسے ظالم بادشاہ تک سے امداد لینے میں پس و پیش نہ کی۔ اس بادشاہ کے ظلم کا یہ حال تھا کہ اس نے ایک برہمن کو محض اس جرم میں مروا ڈالا تھا کہ اس نے اسلام

۲ اور ہندو مذہب کو برابری کا درجہ دے دیا تھا۔ مگر اس تعصب کے باوجود اس نے
 صلاً مداخلت کر کے انکار کر دیا۔ ممکن ہے کہ وہ کبیر کو باقاعدہ صوفی قرار
 دیتا ہو، یا اسے ان کی عمر کا لحاظ ہو، یا یہ کہ اسے کسی فساد کے برپا ہو جانے کا
 اندیشہ ہو۔ بہر حال کچھ ہی وجہ کیوں نہ ہو، اس مصلح قوم کو شہابی
 ہندوستان اور گجرات میں اپنے مشن کے پھیلا نے کا خوب موقع مل گیا۔ مگر ان کے
 'بلم' 'با' 'بخارا' جانے کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ان کے - رید تمام طبقوں اور
 جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی بیٹی کی شادی برہمن لڑکے سے ہوئی ہے
 اور ان کا روحانی سلسلہ دھرم داس نے جو وشنوجی کا پجاری تھا، قائم و برقرار
 رکھا۔ خود ان کی عمر بہت طویل ہوئی، اگرچہ یہ کہنا مشتبہ ہے کہ جب ان کا
 انتقال موجودہ ضلع بستی کے موضع مگھرا میں ہوا تو اس وقت ان کی عمر ۱۲۰
 سال کی ہو چکی تھی۔

رامانند نے شاگردوں میں جو مذہمی علم ادب میں نمایاں حیثیت رکھتے
 ہیں، کا کرن کڑ کا ہندو راجہ، 'پیپا دھنا' ناسی جات، 'سائیں نامی حجام'
 اور راؤ داس سوچی سب شامل تھے۔ مگر ان سب میں بڑے بڑے کر
 کبیر تھے۔

کبیر کا کام یہ تھا کہ اپنے گرو کی تعلیمات کو انتہا تک پہنچا دیں اور جس
 بات کو اس حق جانیں اس کا بے تھوک پرچار کریں۔ تمام لوہام باطلہ، رسوم
 قبیلہ اور اُن باتوں کے خلاف جو تہذیب کی برائیوں کے نام سے موسوم ہیں،
 استقلال کے ساتھ جہاد جاری رکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ صوفی دنیا کے سب سے بڑے
 عملی آدمی ہوا کرتے ہیں۔ کبیر باوجود صوفیوں کے سر تاج ہونے کے نہایت
 عملی مصلح بھی تھے۔ انہوں نے قدرتاً اپنی تعلیمات کے پرچار کے لئے ملکی
 زبان ہی کا استعمال کیا۔ ایک جانب خیالات کی آمد تھی اور دوسری طرف
 جذبات تھے کہ وہ اظہار کے لئے گڑبڑ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی

قوت گویا ڈی بہت جلد افتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ ان کی شاعرانہ قوت اعلیٰ وارفیع تھی اور وہ ان کے مزاج کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے زمانے کی اسپرٹ (اقتصاد) اور خود ان کی شخصیت ان کی کامیابی کا بہت بڑا وسیلہ تھی۔ لیکن اس سے قطع نظر، 'والٹیر' کی طرح ان کی درازی عمر بھی ان کی کامیابی کی بڑی وجہ تھی۔

یہ اعلیٰ درجے کی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ کمیر نے اصلاح مذہب کے مرکزی نقطے کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا، یعنی بدکہ خداے برتر کی خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت کرنا اور اس نے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور اس کی سلطنت کا مرکز اقلیم دل ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:—

پھولوں کے باغ میں نہ جا، اے دوست وہاں نہ جا !

خود تیرے جسم میں پھولوں کا باغ پوشیدہ ہے۔

”تو کنول کی ہزار ہا پتیوں میں اپنی جگہ بنا، اور وہاں سے حسن

لا زوال کا تماشا کر۔

”ہمہ اوست“ کے خہال کی سختی کے ساتھ ترویج فرماتے ہیں:—

”مخلوق برہما (خالق) میں ہے اور برہما خود مخلوق میں موجود ہے۔“

وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں اور ملے ہوئے بھی۔

وہ خود درخت بھی ہے بیج بھی اور نمو بھی وہی ہے وہ خود پھول ہے۔

سیوہ بھی اور سایہ بھی وہی ہے۔

وہ خود سورج ہے، روشنی بھی اور ہر وہ چیز بھی جو روشنی سے منور ہو جائے

وہ خود برہما ہے، مخلوق بھی اور مایا بھی۔

وہ خود مختلف صورتوں میں اور لامحدود مکان میں جلوہ گر

ہو تا رہتا ہے —

وہ خود سانس ہے ' لفظ بھی اور لفظ کا مفہوم بھی وہی ہے۔

وہ خود حد ہے ' خود ہی لا محدود بھی ہے ' اور محدود اور لا محدود کی

حدود سے بالا تر بھی ہے۔

وہ خود پاک ہے اور ہر آلائش سے سبرا ہے ' وہ برہما اور مخلوق

میں سائر و دائر ہے ' —

اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ بہت پرستی نہ صرف بیکار محض ہے،

بلکہ خالصتاً مضرت رساں بھی ہے۔ کبیر فرماتے ہیں کہ ”اگر پتھر کی سورتیوں کی

پرستش در حقیقت خدائے برتر تک پہنچا دیتی تو میں سارے پہاڑ ہی کو

پوجنے کے اٹے آمادہ ہو جاتا۔ لیکن پتھر کی سورتی سے تو آگے کی چکی ہی بہتر ہے

جو انسان کے اٹے آٹا تو پیدا کرتی ہے۔ اس کی پرستش کرنا نوا اندھا پن ہے۔

پروہتوں نے صرف اپنے ذاتی فائدے کے لئے یہ سب رسم و رواج بنا رکھے ہیں۔

ہم سب کا فرض ہے کہ اصلی نام کو جیتے رہیں۔“

اپنے طعنہ آمیز رنگ میں وہ مندروں اور مسجدوں کی مذمت کرتے ہیں ”دنیا

مندروں کے آگے جھکتی ہے، لیکن فی الحقیقت خدا کے رہنے کی جگہ تو انسان کا دل ہے۔

کیا خدائے تعالیٰ بہرا ہو گیا ہے کہ ملا کو مسجد کے میٹاروں پر سے چلانے کی ضرورت

پڑتی ہے؟ افسوس صد افسوس دنیا کی حماقت پر! جس نے اندھی تقلید کی

پیروی کو ذریعہ نجات سمجھ رکھا ہے۔“

”اے قاضی! اب کو نسی کتاب کا وہ ظام کہتے ہو۔ تم تو ہر وقت جھگڑتے

اور مباحثہ کرتے رہتے ہو۔ تم کو عقل و دانش کی کوئی بات نہیں آتی۔ تم مجھ

سے نخر یہ اچھے میں ختماء کرا لے کے اٹے کہتے ہو۔ مگر بھائی، میں تو اسے برداشت

نہیں کر سکتا۔ اگر یہ ختمہ خدا کی طرف سے ہے تو فطرتاً انسان کیوں ایسا پیدا

نہیں ہوتا؟ اگر ختمے کے ذریعے کوئی شخص ترک بی سکتا ہے تو تمہاری عورتوں

کے بارے میں کیا کہا جائیگا؟ بیوی کو تم آدھا جسم کہتے ہو۔ تو یہی تم اس کے بعد ہندو ہی رہے۔ زفار پہننے سے ایک شخص برہمن بن جاتا ہے، لیکن تم نے پہننے کے لئے عورتوں کو کیا چیز دی ہے؟ عورت تو پھدائش ہی سے شو در ہے۔“

”اے پاندے! تو کھاتا کیا ہے؟ ہندو اور ترک، یہ کہاں سے آئے ہیں۔ یہ راستہ کس نے نکالا ہے؟ اپنے دل کی تلاشی او اور اچھی طرح سے تلاشی لو، بہشت کہاں ہے۔ کس نے اسے حاصل کیا ہے؟ اے بیوقوف! ان خالی خولی باتوں کو ترک کر اور رام نام چپ۔ تم تو بد معاشی کی باتیں کرتے ہو۔ اے کبیرو! جس نے آخری وقت میں رام کی حفاظت قبول نہ کی وہ سخت کھاتے میں رہا۔“

جانوروں کے بھینٹ چڑھانے یا قربانی دینے کی رسم کی بھی سخت الفاظ

میں مذمت کی گئی ہے :-

”اے بیوقوفو اور جاہلو! تم راستے سے ہٹک گئے ہو، کیونکہ تمہیں کسی وقت بھی رام کی خبر نہیں ہوئی۔ تم گالے پر حملہ کرتے ہو اور اس پر ضرب لگاتے ہو اور اس کی جان لینے کے واسطے اس کا گلا کاٹتے ہو۔ تم زندوں کی جان لینے کے لئے انہیں مردہ بنا دیتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تمہاری قربانی اللہ کے لئے ہے۔ اے بھائی! یہ گوشت جسے تم مقدس شے جانتے ہو، تمہیں خبر ہے کہ کس چیز سے بنا ہے؟ گوشت خون اور لطفے سے مرکب ہے، لہذا جو گوشت تم کھاتے ہو وہ فاپاک ہے۔ اے بیوقوفو! تم اس جہالت کا اعتراء نہیں کرتے، بلکہ کہتے ہو کہ تمہارے بزرگ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ اس کا خون تمہاری گردن پر ہے اور نیز ان پر جلوں نے تمہیں ایسی قلیق دی۔ شباب کے سیاہ بال جاتے رہے ہیں، لیکن ابھی تک تمہارے دل میں سفیدی نہیں آئی۔ تمہارے روزے، تمہاری نمازیں، اذانیں، تمہارا چوٹی کوٹھریوں میں مرنے، کس کام آئیگا؟ ان کے وید اور پرانوں کو پلٹ پڑھتے ہیں اور مولوی اپنے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ لیکن کبیرو کا کہنا یہ ہے کہ وہ سب ہوز کا ایندھن بنیں گے جو رام سے ناواقف رہیں گے۔“

کبیر کی نظر میں روزے اور حج غیر ضروری ہیں، بلکہ وہ اس زہریلی پھل کی طرح ہیں جو درخت پر پھیل کر درخت کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اس پر اعتقاد رکھنا سہاک دھوکا ہے۔ اصلی فام کو یاد رکھو اور کرو کو بھی۔ نیکی جو ایمن دین کے طریق پر کی جائے، بیکار محض ہے۔

وہ مقدس جماعتیں جو مختلف قسم کے اوہام باطلہ کی حاسی رہی ہیں اور جن میں متعدد افراد کی زندگیاں شرم ناک رہی ہیں، کبیر کے غصے کا جائز طور پر نشانہ بنیں اور انہوں نے ان پر نہایت شدید نکتہ چینی کی ہے۔ فرماتے ہیں :-
(۱) "ایک کدھا برہمن سے بہتر ہے۔ ایک کتا مورتیوں سے افضل ہے۔"

مرغا ملالے سے بہتر ہے اس لئے کہ وہ سوتے ہوئے شہر کو جگا دیتا ہے۔"
(۲) کل جگ کا برہمن محض مسخرا ہے۔ اسے خہرات ست دو۔ وہ اپنے ہاں بچوں سمیت سیدھا دوزخ میں جاٹھکا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ججمنوں کو بھی لے جاٹھکا۔"

اسی طرح جھوٹے کرو کی بھی افہوں نے بہت مذمت کی ہے۔ سخت سے سخت الفاظ ہیں اس کی شیطانی سیرت اور اس کے نقصان رساں اثرات کو پورے طور پر ظاہر کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اچھی اور بری صحبت کے مضمرات پر کبیر نے بہت سے ارشادات ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(۱) "اچھی صحبت خوشی پیدا کرتی ہے۔ بری صحبت تکلیف پہنچاتی ہے۔ جاؤ اور جا کر سادھوؤں کی صحبت میں بیٹھو۔"

(۲) کبیر کہتا ہے کہ "اچھوں کی صحبت دوسروں کی تکلیف دور کر دیتی ہے"۔ سب اشخاص کی رہنمائی کے لئے؛ ہوا، وہ پر وخت ہوں یا مولوی، نو جوان ہوں یا بوڑھے؛ کبیر نے چند اخلاقی نصائح کئے ہیں جو اپنی رفعت کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ یا مہاتما بدھ، کلفیو شس یا زر تشت کے نصائح سے ملتی جلتی ہیں۔

اور اس میں سے بعض تو ضرب الاسل کے درجے تک پہنچ گئی ہیں: —

(۱) کبیر کا قول ہے کہ ” کبھی غرور نہ کرو - موت تم کو بالوں سے پکڑ لے گی -

معلوم نہیں کہ وہ کہاں آجائے ، گھر میں یا باہر ” —

(۲) اس دنیا میں آجانے کے بعد تکرر نہ کرو - لے لو جو کچھ تمہیں لہنا ہے -

یہ منقوی بند ہو جانے کے قریب ہے ” —

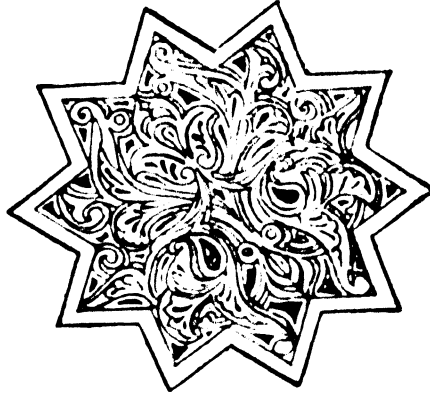
(۳) ” افسانی زندگی بلبلے کے مانند ہے ، وہ صبح کے تاروں کی طرح آ نآ فنا ٹائب

ہو جاتی ہے ” —

بلاشبہ کبیر کی تعلیمات میں معاشرتی نظام کے بعض پہلوؤں سے بھی بھٹ کی گئی ہے - ان میں ایک خدا ، اخوت انسانی اور کرو کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے - اور یہی تعلیم ذات پات کے اختلافات کا بطلان کرتی ہے - نہ تو خود انہوں نے اور نہ ان کے بعد چیلوں میں سے کسی نے باقاعدہ تنظیم کے ساتھ معاشرتی مصلح کی حیثیت اختیار کر نے کی کوشش کی - عورتوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہوا - بیواؤں کی سستی کی رسم کی انہوں نے مذمت نہیں کی - صغر سنی کی شادی یا تعدد از دواج کو جوں کا توں برقرار رکھا ، مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زمانے کی حالت معاشرتی نظام میں کسی وسیع تغیر کو قبول کرنے کے خلاف تھی —

یہی کبیر کی انتہائی کمزوری ہے - اس نے عملی نتائج یہ ہیں کہ ان کے بہت سے ماننے والے ابھی تک ہندو مذہب پر اعتقاد رکھتے ہیں اور ہندو عبادت اور ظاہری مذہبی رسوم کے بھی ایک حد تک پابند ہیں - ہندو مذہب میں جانب کرنے کی جو حیرت انگیز قابلیت موجود ہے - اسے اس کمزوری سے ایک گونہ طاقت حاصل ہوئی ہے - آج متعدد کبیر پلٹھی اپنے باقی ہندو بھائیوں سے بہت زیادہ اختلاف نہیں رکھتے اور وہ کبیر کو ذات اعلیٰ کا اوتار سمجھتے ہیں اور ان کے گرو کو اس دنیا کے خلیفہ کا درجہ دیتے ہیں —

کبیر کو اوتار قرار دینا بطور خود ہندو اثرات کی بھی مثال ہے۔ کرو کی تعظیم ایسے اشخاص کے لئے لازمی تھی جو جھوٹے دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرنے، بقوں کی تعظیم کرنے، روزے اور حج (جاٹو) کرنے یا روحانی تسلی کے دوسرے ذرائع سے اپنے دلوں کو اطمینان نہ دے سکتے تھے۔ بہر حال اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اعتقاد میں پکے تھے اور فیروزہ جو ذرا تانوا تول رہتے تھے، سب کے سب ایک ہی حالت میں جکڑے رہے —



اُردو کے ان بڑے شاعر

از

(جناب مرزا فدا علی صاحب 'خنجر' لکھنوی)

— : ۰ : —

آباد

ان کا نام محمد یعقوب علی خان بن احسان علی خان اور 'آباد' تخلص تھا۔ مولد و مسکن دہلی۔ بڑے وجید و خوش منظر جوان تھے۔ 'تاباں' کی طرح دہلی کے کوچہ و بازار میں ان کے حسن صورت نے شہرت و مقبولیت حاصل کر لی تھی اور اسی حسن و جہال کی بدولت ہر صحبت میں ہاتھوں ہاتھ لگے جاتے۔ باوجود اس شکل و شہادت کے اطوار و عادات اچھے نہ تھے۔ آوارگی پسند خاطر تھی۔ بد صحبت نے بے اعتدالیوں کی طوط راغب کر رکھا تھا۔ ابتدائے صغر سے خصلت بگڑ چکی تھی۔ ہرچند پڑھنے پتھانے لگے۔ سر پرستوں نے تعلیم و تربیت میں کدواکوش کی، لیکن 'آباد' دولت علم سے محروم رہے۔ مبداء فہائے طبیعت مولوں اور ذہنی وسعیت ہوا تھا۔ اگرچہ پڑھنا لکھنا نہ آیا، مگر درس گاہ سخن میں داخل ہو کر رشتہ نظم میں در مضامین پروانے لگے۔ کلام صاف و بامزہ ہوتا ہے۔ ثقیل الفاظ بالکل نہیں ہوتے۔ آخر وقت میں اپنی غلط کاریوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ جب گذشتہ زندگی کا نقشہ سامنے آتا تو نہایت قلق ہوتا، جذبات شاعری میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی اور وہ اُسی عالم میں اپنی آوارگیوں پر پشیمان

ہوتے ہوئے یوں گُل فشاں ہوتے :-

ان خراباتیوں کی صحبت نے تجکو 'آباد' کیا خراب کیا
 'آباد' کے سنہ ولادت و وفات کا پتہ نہیں چلتا، لیکن بعض تذکرہ نویسوں کا بیان
 ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ ع کے قدر میں جوان تھے۔ ان کی طبیعت کا اندازہ ان تین اشعار
 سے محال ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو طبیعت کی افتاد سے اطلاع ہوسکتی ہے —
 اُس کی قاصد کی یاد میں ہم نے مصرع سرو انتخاب کیا
 تولے دریا میں اک نکاح کے ساتھ قطرۂ آب کو شراب کیا
 ان خراباتیوں کی صحبت نے تجکو 'آباد' کیا خراب کیا

آزاد

یہ اُسی شاعر قصبہ ہدایوں میں پیدا ہوا، نہایت وارستہ طبیعت و آزاد
 مزاج تھا۔ خاندان میں لوہاری کا کام چلا آتا تھا، اسے بھی یہی ہمیشہ تعلیم کیا گیا۔
 اہل ہدایوں فطری طور پر شاعری کے دلدادہ ہیں۔ 'آزاد' کو گاہ گاہ اُن اہل ذوق
 کی حضوری کا شرف ملتا رہتا تھا۔ وہ اُن کے فیضان سخن سے لطف اندوز ہی نہیں ہوا
 بلکہ طبیعت کے میلان اور سوز و غم سے شاعر بھی بن گیا۔ مزاج میں ظرافت کا عنصر
 بقدر مناسب موجود ہے، جو اشعار میں نمایاں ہوکر ہر لطف شیرینی پیدا کردیتا ہے۔
 افسوس! اس لہجہ شاعر کے حالات فراہم نہ ہو سکے، نہ کلام ہی زیادہ دستیاب ہوا
 جو اس کمی کی تلافی میں پیش کیا جاتا۔ ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۲۷ ع ہفتے کو سلم ہوسٹل
 الہ آباد میں صحبت مشاعرہ تھی، جس میں بیرونجات کے شعرا بھی شریک ہوئے تھے۔
 لکھنؤ سے بھی بعض بعض حضرات تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ جناب 'آسی' بھی

بغرض شرکت مشاعرہ کئے تھے۔ وہاں جناب 'قمر' ہدایونی سے ملاقات ہوئی اور 'آزان' کا تذکرہ چھڑا۔ جناب 'آسی' کی معرفت ہمیں مذکورہ حالات اور ایک شعر دستیاب ہوا :-

'آزان' کی ہے خانہ بدوشی کا یہ عالم
کاندھے پہ لٹے پھرتے ہیں چھپر کئی دن سے

— : 0 : —

احمد

احمد علی نام 'احمد' تخلص۔ اصل شریف لیکن غربت و نکبت نے ادنیٰ درجے کی ملازمت پر مجبور کیا۔ چنانچہ 'احمد' کے والد نواب والا قدر وزیر مرزا بہادر مغفور کی تیوڑھی پر چوکیداری کی خدمت انجام دیا کئے اور والدہ محل میں خاصہ بوداری کے کام پر ماسور رہیں۔ خود 'احمد' کو صغر سنی سے ملازمت کی ضرورت پڑی اور بعض سرکاروں میں شاگرد پیشہ کی حالت میں بسر کی۔ خدمت گاری کے سلسلے میں ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں کی سیر و سیاحت بھی کی جس سے خاصہ تجربہ حاصل ہوا 'آدمی خوش قطع اور زندہ دل ہے۔ فی الحال کلکتے میں قیام ہے اور خزانچہ لگائے ہر ہر اوقات۔ عادات و اطوار پر بد صحبت نے پورا پورا اثر کیا ہے 'سنہیات سے پرہیز نہیں' لہو و لعب میں وقت گزرتا ہے۔ چالہس ہمالیس برس کا سن ہے 'مگر نشہ کی چیزوں کے استعمال نے صحت کو بگاڑ دیا ہے —

ابتداءً شباب میں شاعری کا شوق ہوا تھا۔ لکھنا پڑھنا صرف اسی قدر آتا ہے کہ اپنا نام لکھ لیں یا قصہ کہانیاں جو جلی حروف میں لکھی ہوں انہیں ہجا کر کے کہنتوں میں دس پانچ لفظیں پڑ لیں 'مگر جوانی کی ولولہ خیز آہنگوں نے طبیعت میں ابال پیدا کیا اور گاہ گاہ در چار شعر نظم کرنے لگے۔

اُن دنوں مرزا سجاد علی 'دماغ' مرحوم حیات تھے اور 'احمد' اُن کے یہاں ملازمت کرتے تھے۔ ایک روز درتے درتے 'دماغ' مرحوم کے سامنے اپنی تصنیف کی ہوئی غزل اصلاح کے واسطے پیش کی۔ 'دماغ' مغفور کو شاعری کا بے حد شوق تھا اور شاعروں کی کمال عزت کرتے تھے۔ 'احمد' کو فنی سخن کی جانب مائل دیکھا تو خواہی ہوے اور ان پر خاص عنایت فرماتے لگے۔ حوصلہ افزائی کے خیال سے اصلاح کلام قبول کی اور غزلوں کو بناتے لگے، جن میں کئی اکثر غزلیں اس زمانے کے رسالوں میں شائع ہوا کیں۔ ترتیب تذکرہ کے وقت رسالہ 'پیام یار' میں ایک غزل مل گئی جو درج کی جاتی ہے :-

عارض یار پہ کاکل نہیں لہرائی ہے
صبح سے رات کلے ملنے کو یہ آئی ہے
دامِ اُلفت میں اُسی دن سے مرا دل ہے اسیر
خواب میں جب سے تری زلف نظر آئی ہے
مژدہ لے بادہ کشو! خوب کرو سے نوشی
ٹہلٹی ٹہلٹی ہے ہوا اور گھٹا چھائی ہے
اب تو بھتی نہیں مجھ تو بہ شکن کی توبہ
خوب اُٹھی ہے گھٹا، خوب گھٹا چھائی ہے
کون مارا گیا ذاکام تمنا یارب!
کہوں یہ روتی ہوئی مقتل سے قضا آئی ہے
کون غمخوار ہے میرا شبِ فوقت 'احمد'
ہمنشیں ایک فقط گوشہ تنہائی ہے

امراؤ علی

منشی امراؤ علی خان نام اور 'امراؤ علی' تخلص تھا۔ کوئل کے رھنے والے تھے۔ کھیل کود کی وجہ سے اسی محض رہے، لیکن بلا کی طبیعت پائی تھی، خصوصاً قوت لسانی بہت بڑھی چڑھی تھی۔ گفتگو میں ہندو فالتو آتا ہی نہ تھا۔ ہر موضوع پر تقریر کرنے کو آمادہ ہو جاتے اور اس بے تکلفی سے بحث کرتے گویا پوری معلومات حاصل ہے۔ ان کی اس خصوصیت پر عام تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے، چنانچہ مولوی عبد الغفور 'نساخ' اپنے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں:

”امراؤ علی خان، ساکن کوئل مقیم اکبر آباد، ہر ہند حریف نا آشنا تھا، مگر بڑا ذہین و ذکی تھا۔ ستر برس کی عمر میں انتقال کیا۔“

صاحب خمضانہ جاوید اس عبارت میں ان الفاظ کے اضافے کے ساتھ رقم طراز ہیں:

”چرب زبان ایسے تھے کہ حریفوں کو سامنے بولنے کی مجال نہ ہوتی، اگرچہ اسی تھے لیکن قوت بیانیہ، ذہن رسا اور تیزی حافظہ کی بدولت کالموں کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے اور کسی سے ہلک نہ ہوتے۔“ الخ —

مختلف زبانوں کے اکثر بلکہ ہزار ہا الفاظ از بر تھے، اودو فارسی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، اور ترکی زبانوں کی لفظوں کے بھی حافظ و ساهر تھے، جلیہیں دوران گفتگو میں بے تکلف استعمال کر کے سامعین کے قلوب میں اپنی وجاہت معلومات راسخ کر دیتے۔ اگرے میں زیادہ تر قیام رہتا، سلہ ۱۸۵۷ ع کے غدر سے پہلے ستر برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ منشی کہنے سے بہت خوش ہوتے تھے، اس لئے ان کے احباب نام کے ساتھ لفظ منشی ضرور استعمال کرتے، تذکروں میں صرف

دو شعر ان کے نام سے دیکھے گئے :-

فزع میں دیکھا تو بولے ضعف آیا ہے اسے
مرگ تک ہم سے رہیں کافر کی ٹھٹھے بازیاں

دو پھول گر کسی نے چڑھائے آزا دیے
بد صبا کو گور غریباں سے لاکھے

— : 0 : —

اُمی

روشن بیگ نام ' اُمی تخلص - حمیدالدولہ کے بیٹائی تھی ' جو ابو ظفر آخری
تاجدار دہلی کی سوار میں بڑا سائنڈ واپس دہلی داروغہ و منصور تھے - خاک پاک دہلی
سے خمدار ہوئے اور وہیں تیرہویں صدی ہجری میں پیوند زمین ہو گئے - اکتساب
علوم کی جانب بالکل توجہ نہ تھی ' مدرسے میں کپیل کود کا شوق رہا - استاد سے
جو کچھ پڑھا اسے طاق نسیاں پر دھرتے گئے ' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم سے بالکل
کوڑے رہے ' ملتھائے جہالت یہ کہ اپنا نام بھی لکھنے سے معذور تھے ' مگر مہذب فیاض
نے قیامت کی ڈھانٹ اور بلا کا حافظہ عطا کیا تھا - جس واقعے کو ذہن میں محفوظ
کیا ' ساری عمر فراموش نہ ہوا - اُن دنوں شاعری کا عروج تھا اچھے اچھے شاعر پیدا ہو
رہے تھے ' شاہ نصیر کا طوطی بول رہا تھا ' اور اردو زبان اُن کی کود میں پرورہی
پارہی تھی - شائقین سخن ان کے روز مرہ ' صفائی بندش ' حسن ادا ' لطافت مضامین
اور پاکیزگی تخیل پر سر دھن رہے تھے - شیخ ابراہیم ' ذوق ' (جو بد کو " خاقانی
ہند " کے خطاب سے سرفراز ہوئے) حکیم سومن خان ' سومن ' میر حسین

’تسکین‘ سے خوش فکر و خوش گو ہونہار شعرا ان کی شاگردی کا دم بھر تھے تھے۔ اسی کا عنفوان شباب تھا۔ جذبات کی فراوانی، اسلوگوں کی کثرت نے فن لطیفہ گوئی (شاعری) کی جانب متوجہ کیا۔ استعداد علم تو تھی ہی نہیں، فطری لگاؤ خضر راہ بنا۔ رسائی ذہن اور موزونی طبیعت کی بدولت کچھ کچھ نظم کرنا شروع کیا۔ شرفائے دہلی کی صحبت و ہم نشینی نے مذاق سلیم اور ذوق صحیح پیدا کر دیا۔ ابتداءً جو کچھ کہا، حلقۂ احباب میں پڑ کر سنایا۔ اہل دہلی کا تمام تر رجحان صفائی بندھی اور لطف زبان کی طرف تھا۔ اسی کے کلام میں ان چیزوں کی کمی نہ تھی، ایک ایک شعر معاملہ بندھی کا دفتر اور لطف روزمرہ کا مذہب ہو رہا تھا۔ داد ملی اور امید سے زیادہ ملی۔ اب کہا تھا: ذوق سخن درنا ہو گیا، طبیعت نے دریا کی سی روانی اختیار کی، روز ایک دو غزلیں تصنیف ہونے لگیں۔ قدما کا کلام الٰہی بر تھا، موجودہ شاعروں کی غزل سرائیاں سننے میں آ رہی تھیں، مشاعروں میں ایک سے ایک زیادہ لطیف شعر سامعہ نواز ہوتا اور اسی کی معلومات کا ذخیرہ بڑھتا جاتا۔ طبیعت موزوں ہو تو عروض کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی، جذبات قلبی خود بخود نظم کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

شعر می گویم بد از قند و نہات

سے نہ دائم فاعلاتن فاعلات (مولانا رومی)

الغرض اسی کا میلان طبیعت اُن کو اُس طرف لے چلا، جدھر اُس زمانے کے شرفا نہایت سرعت و تیزی سے کام لے رہے تھے۔ چونکہ راہ سے نابلد، رستہ ناہموار، ذرا سی لغزش میں منہ کے بل گر پڑنے کا اندیشہ، اس لئے ایک راہبر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب تک کہ اُستاد فن نکات شعر نہ سمجھائے، اُسی کے سے آدمی کے لیے اُن کا سمجھ لینا محال تھا۔ اُن دنوں عام خیالات شاہ نصیر کی شاعری میں تو پے ہوئے تھے۔ اُسی بھی اس اثر سے محفوظ نہ تھے۔ نصیر کی شیوہ بیانی،

دس مہیں گھر کر چکی تھی۔ یہی عقیدت و ارادت محرک ہوئی اور یہ ایک روز ان کی خدمت میں جا پہنچے، موقعہ و محل سے اپنا عندیہ ظاہر کیا، شاہ نصیر بہت ہی خلیق تھے، کسی کی درخواست مسترد کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ راضی تو ہوئے لیکن اُمی کی جہالت کا تصور کر کے متفکر ہو گئے۔ گویا وہ شخص جس کو فن شہسواری سے کوئی علاقہ نہ ہو، منہ زور گھوڑے پر سوار ہو کر فلوں سپہ گری اور چوگان بازی دکھانے کا خواستگار ہے۔ امتحاناً چند اشعار سناتے کا حکم دیا۔ اُمی نے تعمیل ارشاد کی۔ شعر سنئے تو دیوانہ رہ گئے، بہت خوش ہوئے، اُمی وقت غزل کو اصلاح دے کر حسنِ صوری و معنوی سے آراستہ و مزین کر دیا۔

اُس روز سے اُمی بھی حافظ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ استاد شفیق نے ساتھ مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دینے لگے۔ روز مرہ اور معامہ بنفسی ان کے کلام کی جان ہے۔ ثقیل الفاظ سے قطعاً احتراز کرتے ہیں۔ بعض اشعار سے جہالت و لاعلمی اپنی جھانک دکھاتے ہیں۔ باوجود افلاطون کی موجودگی کے بھی ایسے شاعر کو اُس کی طبعِ خدا ساز کی جولانیوں کی داد نہ دنیا غضب ہے، افسوس! اُمی مرحوم کا کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ تذکروں کی ورق گردانی اور چٹان بین کرنے سے جو اشعار فراہم ہوئے، نذر نگاہ شائقین کئے جاتے ہیں:

جہاں زنجیر ہم ساقیے ہیں، ملگوا مول لہتے ہیں

توس زلفوں کے سودے میں یہ سودا مول لہتے ہیں

جی دھڑکتا ہے کہ پہنچے میں نہ آجائے لہک

ہاتھ سے چوڑ دیا میں نے ترا جان کے ہاتھ

گرمی سے سے زباں پر آبلے پڑتے ہیں کیا

اے مغاں! اس میں مغیلاں کی بھی پڑتی چھل ہے

امیر

میر امیر علی فام امیر، تخلص شاہجہاں آباد کے باشندے اور میر مؤمن علی کے فرزند تھے، جو دہلی کے متوسط الحال شرفا میں شمار کئے جاتے تھے اور اُسراے شہر کی سرکاروں میں ملازمت کر کے کسب معاش کرتے تھے۔ زمانے کو شرفا سے بیر ہے، اکثر خاندان اس جفا پیشہ کی ستمرا نیوں سے مغلوب ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئے۔ بہتوں نے خستہ حالی اور در ماندگی میں عہریں بسر کر دیں، لیکن غیرت و حمیت ذاتی نے کسی ایسے فعل کی اجازت نہ دی جو اُن کے دامن خودداری پر بدنہا دہما بن کر نمودار ہوتا —

میر مؤمن علی کے ساتھ بھی زمانے نے وہی سلوک کیا، جو اور شرفا کے ساتھ کرتا آیا ہے۔ ہیمہ تنگ دستی اور نکبت و افلاس میں بسر ہوئی، یہی سبب تھا کہ ہونہار فرزند میر امیر علی 'امیر' کو تعلیم نہ دوا سکے، رسم مروجہ کے موافق مسجد میں بیٹھ کر درس و تدریس کرنے والوں میں سے کسی ملائے حوالے کر دیا، جہاں غریب امیر کو علم حاصل ہونے کے بدلے خدمت گاروں کی طرح سودا سلف خریدنے کی کافی سہارت ہو گئی —

بے چارے مدرسے سے نکلے تو بالکل ویسے ہی تھے جیسے داخل ہوئے تھے۔ ملا صاحب کے فیض تربیت نے علمی مفاد سے کایتاً بے نیاز رکھا۔ اور تو اور اتنا بھی نہ ہوسکا جو ضرورت کے وقت اپنا نام لکھ سکتے —

تعلیمِ علم کا زمانہ تو ملا صاحب کی خدمت گزاری میں بسر ہوا۔ اُس کے بعد وہ فصل شروع ہوئی جو جوانی دوانی کے فام سے مشہور ہے۔ جذبات فوجوانوں کو اکثر غلط راستوں پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن امیر کے حصے میں وراثتاً شرافت آئی تھی۔ جوان ہوتے ہی علما و صلحا کی صحبت اختیار کی، ہر چند خود تو پڑھے لکھے نہ تھے مگر اُن کے عالمانہ مکالمے سن سن کے اچھی معلومات بہم پہنچالی۔ اس صحبت

نے ایک طرف اخلاق و عادات کی درستی کی تو دوسری جانب جلّے ڈھلی کا کام کیا۔ انجام یہ ہوا کہ فی تقریر و خطابت میں دخل ہو گیا۔ باوجود جہالت کے جس موضوع پر زبان کھولتے بے تکلف بولتے چلے جاتے کسی مقام پر معجز طبیعت ظاہر نہ ہوتا۔ اکثر تاریخی افسانے اڑ رہے تھے جنہیں محل و موقع سے بیان کر کے سامعین کے قلوب کو محفوظ و مسرور کرتے۔ اسی کمال کی بدولت 'امیر' سو-ائٹی کی جان تصور ہونے لگے۔ اُمر کی دل چسپ و باکیف صحبتیں ان کی خوش گفتاریوں اور بذلہ سنجیوں سے صحن گلزار بن گئیں جہاں توائف بلبل اور صوت ہزار کی سی کیفیت طاری رہتی۔ ہرچند اور لوگ علم مجلس سے اطلاع رکھتے تھے، لیکن امیر کی خصوصیت جہل نے انہیں ہم معصروں پر فوقیت عطا کر دی تھی۔ جو ان کی تقریریں اور شیوہ بیانی سنتا حیران و ششدر رہ جاتا۔ چوں کہ شعر و سخن کا بازار گرم تھا کوئی صحبت کوئی مجلس اس ذکر اس فکر سے خالی نہ تھی، ادنیٰ و اعلیٰ ہر ذرا پیر باد سخن کے متوالے ہو رہے تھے۔ شاعری کے بغیر کسی کی دل چسپی ہی نہ ہوتی۔ خصوصاً 'امیر' سے شخص کو جسے اپنی تقریر دل چسپ و دل پذیر بنانے کے لئے جابجا اشعار کی آمیزش سے رنگیلی پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

آخر الامر یہ ضرورت محرک سخن سرائی ہوئی۔ خزانہ قدرت سے طبع موزوں اور ذہن رسا لائے تھے، اُس پر سخن سنجان دہلی کا فیض صحبت سونے پر سہاگا ہو گیا۔ شعر کوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ذوق صحیح نے رہبری کی، فکر بلند نے ہاتھ تھاما اور 'امیر' شاعر بن گئے۔ طبیعت نزاکت پسند واقع ہوئی تھی، طائر خیال نے فضاے بسط میں پرواز شروع کی۔ سامنے کے مضامین پسند نہ آئے، نازک و لطیف خیالات کو لفظوں کے رنگ و روغن سے رنگ رنگ کر سقے تیار کئے، مگر کم استعدادی نے جوہر کمال پر پردہ ڈالا۔ جو مضامین بلند خاطر نشیں ہوتے، اُنہیں الفاظ نہ ملنے سے حسبِ دل خواہ اور بے عنوان احسن نظم نہ کر سکتے۔ بعض مقامات پر بلند کی سستی پھیلاہی ظاہر کر کے لطف شعر کو کھٹا دیتی،

جو محض کم علمی کا باعث ہے۔ لیکن ان خاصیتوں کی وجہ سے ان کا سرتہا شاعری پست نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ معذور تصور کئے جانے کے قابل نہیں۔ انہیں پڑھے لکھے شعرا کی طرح علم سے بہرہ نہ تھا جو قدما کے دواویں کا مطالعہ کر کے معلومات شعری میں اضافہ کرتے، یا تاریخ و سیر کی بدولت معلومات کے دائرے کو وسعت دیتے۔ ان کے علم کی ساری کائنات وہ سنی سنائی روایتیں تھیں جن میں واقعیت کا عنصر خفیف اور مبالغے کی بہر مار تھی۔ پھر بھی آفریں ہے اُس طبیمت پر جس نے باوجود عجز علمی ادب اُردو کی خدمت کی —

’اسیر‘ کو فن سخن میں حکیم عزت اللہ ’عشق‘ سے استفادہ حاصل تھا۔ جو کچھ کہتے اُسے ’عشق‘ کی اصلاح سے مزین کر لیتے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے اور حافظے کی مدد سے کلام سناکر شرکائے بزم کو اطف اندوز کرتے۔ دہلی ہی میں انتقال کیا جس ارض پاک سے اُٹھے تھے اُسی خطے میں زمین کا پھونکے ہوئے۔ تذکروں نے کچھ حالات تو بتائے مگر کلام بہت کم نقل کیا، صرف چار شعر ملے جو درج ہوئے :

ہم کو حاصل کھونکہ ہو تیرے قد زیبا کی سیر
کب میسر ہو سکے ہے عالم بالا کی سیر

سبزہ رنگوں پہ زہر کھا کے موائے کوئی دیکھے تو اس ’اسیر‘ کا دل
خوب دیکھا ہے ہم نے خوبیاں کو پھول خوش رنگ ہیں پہ ہاس نہیں
ہوا وہ دیکھے کر ’اسیر‘ کا حال اس کے جینے کی اب تو آس نہیں

— : ۰ : —

بی تر

عشق بلاقی نام ’بدتر‘ تخلص‘ باشندہ لکھنؤ۔ سبزی فروشی تھا۔ موزوں طبع‘

لطیفہ گو، زندہ دل اور حاضر جواب۔ امہروں، رٹھسوں کو مزیدار باتوں، دلچسپ لطیفوں کے اثر سے اپنی جانب متوجہ کر لینے میں کمال رکھتا تھا۔ آم اور خربزے کی فروخت پر سماں کا دارومدار تھا۔ خربوزوں کی فصل میں خربوزے اور آم کی فصل میں قاضی اور تھمی آسوں کی قالیاں لگا کر امیروں اور نوابوں کی تیوڑھیوں پر حاضر ہوتا۔ کچھ اچھے دار باتوں، کچھ اپنے تصنیف کئے ہوئے شعروں اور غزلوں کو سنا سنا کر خوش کرتا اور سودا بیچتا۔ وہ شاعری کے ذوق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے ملہ لگا کر بات کرتے اور خاطر خواہ قیمت دے کر پھل خرید لیتے۔ دونوں فصلوں میں اتلی یافت ہو جاتی کہ میاں 'بدتر' کو ترکاری کا کاروبار کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اور سال بھر فراغت سے بیٹھ کر شعر شاعری میں بسر کرتے۔

اس کا جہل اس حد پر تھا کہ تلفظ بھی صحیح نہ تھا، (ہ) کو (س) اور (ق) کو (ک) سے بدل کر استعمال کرتا لیکن طبیعت کی موزونی اور ذہن کی رسائی نے فاطم بنادیا۔ مشاہروں میں غزل پڑھنے کا شوق بالکل نہ تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ ادنیٰ ہیشہ در ہونے کی وجہ سے شعراے وقت اپنے ساتھ بٹھانا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ 'بدتر' کسی کا شاگرد نہ تھا، جو وقت پر مل گیا، غزل بنوالی اور جہاں گیا ہے تکلف اشعار سنا آیا۔ ایک مرتبہ 'مرزا بہادر' مرزا محمد عباس علی خاں 'جگر' مرحوم رئیس لکھنؤ کے حضور میں حاضر تھا۔ ٹوکرے میں قلمی آم چلے ہوئے سامنے رکھے تھے اور پائین فرہ بیٹھا ہوا لطائف و طرائف بیان کر رہا تھا۔ مرزا بہادر اور اہل صحبت 'بدتر' کی دل چسپ باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ 'جگر' مرحوم کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے اور بیچ بیچ میں اس کی طبیعت داری کے متعلق کوئی گرم گرم فقرہ بھی چھوڑتے جاتے تھے۔ جسے سنی کر وہ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ عرض کرتا "شاعری کیا کرتا ہوں" آم بیچنے کا تھنگ نکلا ہے۔ خدا کی عنایت اور سرکاروں کی بدولت ان دو فصلوں میں سال بھر کے لئے آسودہ

ہوجاتا ہوں۔“ ایک دھائیہ شعر بھی تصنیف کیا تھا جو ایسے موقعوں پر پڑھا کرتا تھا :

تم سلامت رہو اے آم کے کھانے والو!

ہم تو دن رات یہی دل سے دعا کرتے ہیں

شاید اس زمین میں 'بدتر' نے پوری فزل تصنیف کی تو لیکن حافظے کی بیاض میں کوئی شعر محفوظ نہیں رہا، یہ شعر مشہور ہو چکا تھا جو ضبط تحریر میں آیا۔ بڑا منکسر تھا، رٹی۔ دس کے منہ چڑھنے کے زعم میں خود کو نہ بھولا، جہاں جہاں جاتا وہاں کے عملے سے معجز و مراعات پیش آتا۔ ایک دفعہ کسی نے مزاح کی راہ سے 'بدتر' تخلص اختیار کرنے کا باعث دریافت کیا تو جواب دیا "میاں! پڑھا نہ لکھا قوم کا کمزیا بھی کہیں شاعری کر سکتا ہے؟ خدا کی قدرت اور لکھنو کی ہوا کا اثر ہے جو کچھ اوفت پٹنگ بک لیتا ہوں، جیسا کلام ویسا تخلص، سچ یہ ہے کہ دنیا بھر کے شاعر خوشتر اور بلاقی بدتر ہے۔"

ایک روز برسبیل تذکرہ بیان کیا کہ "مجھے دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاعری کا ذکر چلا۔ اُن حضرات کے اشعار سنئے، اپنا بکا ہوا گزارہ کیا۔ سب خوش ہوئے۔ تعریفوں سے حوصلہ افزائی فرمائی۔ ایک صاحب ظریف الطبع بھی تشریف فرما تھے، میرے چھیڑنے کو یہ شعر موزوں کر کے پڑھا:—

ہیں دلی والے، لکھنؤ والوں کے سامنے

ہو جیسے کوئی شیر غزالوں کے سامنے

مجھے یہ مذاق پسند نہ آیا۔ لکھنؤ والوں کو غزال کہہ کر شیران دہلی کا شکار بنا یا گیا تھا۔ سر جھکا کر جواب دینے کی فکر کرنے لگا۔ فوراً مصرع نکلے میں آیا اور میں نے سر اٹھا کر دست بستہ التماس کی حضور! میں نے اس شعر کو پہلے بھی سنا ہے۔ لیکن دوسرے مصرع کی ترکیب بدای ہوئی ہے، اجازت ہو تو عرض

کروں ؟ ” انہوں نے فرمایا : پڑھو ۔ میں نے پڑھا :

ہیں دلی والے لکھنؤ والوں کے سامنے

ہو جیسے نیچورا کوئی کالوں کے سامنے

اور ہاتھ جوڑ کر گزارش کی : ” سرکار ! آپ لوگ بڑے آدمی ہیں

ہندوؤں سے شیروں بھیڑیوں کا شکار کر سکتے ہیں ، شجاعت و دلیری آپ کی

مہراث ہے ، میں تمکے کا کہنیا ، اتنا دل گردہ کہاں سے لاؤں جو ان خونخوار درندوں سے

مقابلہ کروں ۔ میری زندگی تو نہیتوں میں گذری ہے ان کی میندوں پر ہر سات کی فصل

میں اسی قسم لے کیڑے سکوروں کو رینگتے دیکھا ہے اور انہیں کو جانتا پہچانتا ہوں۔

’بدتر‘ کو لکھنؤ سے دلی ، محبت تھی ، یہاں کے شعرا کو دنیا بھر کے شاعروں سے

بہتر سمجھتا تھا اس دہلی و لکھنؤ کے مناقشے و مضاطرے بہت زیادہ متاثر کرتے۔

ان موقعوں پر جہاں تک زبان کو یارا ہوتا وہ اپنی عقل و بساط کے موافق اہل

لکھنؤ کی فضیلت ثابت کرتا اور صفت و ثناء بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ

رکھتا ۔ اس کے مزاج میں پر لطف شوخیاں تھیں ، کوئی بات ظرافت سے خالی نہ جاتی۔

انٹر مٹم ہر یف حضرات ’بدتر‘ کو چھیڑنے کی نیت سے شعراے دہلی کا چرچا کرتے

ہوئے ان کی فضیلت و فوقیت ثابت کرتے جس سے بگڑے دل اسی شاعر چراغ پا

ہو کر الٹی سیدھی تقریر شروع کر دیتا ۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ اشتعال کے وقت بھی

مصطاب کا ادب و حفظ سراتب فور گزارش نہ کرتا —

اخیر عمر میں مرض ضیق النفس میں مبتلا ہو گیا تھا جس سے نہایت

پریشان رہا کرتا ۔ ابتدا سے اکہرے ہاتھ پاؤں کا آدمی تھا ، اس مرض نے کھلا کھلا

کر ہڈیوں کا تھانچا کر دیا تھا ، چند سال ہوئے (سنہ ۱۹۲۲ ع) کے کچھ قبل یا بعد

فوت ہوا ۔ اپنی یادگار ایک لڑکا چھوڑا ، جو فی الحال کانپور میں اپنا پیشہ کرتا ہے۔

اس کا کلام تو زیادہ تھا ، لیکن وارستہ مزاجی کی بدولت سب ضائع ہو گیا ، چند

شعر جو بعض حضرات کے حافظے میں موجود تھے ، دریافت کر کے تذکرے میں

تحریر کیے جاتے ہیں۔ اس سے میاں 'بدتر' کی طبع موزوں کا کچھہ
حال معلوم ہو سکتا ہے —

تڑپتا ہوں دردِ جدائی سے کیوں کر
اُدھر جانے والے اُدھر دیکھ لیتا
جو سچ مجھے یہ عشق صادق ہمارا
تو خود ہوگا تم کو اثر دیکھ لیتا

مر گیا وہ اس تمنا میں نہ سنا تم نے حال "بدتر" کا

وصل سے کر دیا انکار 'یہ کیا تم نے کیا
دیکھو! اک بات میں بس ٹوٹ گیا دل میرا

تسا اُس زلف کی فاگی کا بچتا ہے کہیں 'بدتر'
مرے جینے کی چارہ ساز کیوں تدبیر کرتے ہیں

تم سلامت رہو اے آم کے کھانے والو!
ہم تو دن رات یہی دل سے دعا کرتے ہیں

وفا داری میں کاٹی زندگی، اُس کی سزا یہ ہے
ہماری لاش کو بھی کو بکو تشہیر کرتے ہو

اُس کی آنکھوں میں کب حیا آئی جان لیتے کو یہ ادا آئی
جب سے اُس شوخ کا شہب آیا دل بیتاب کی قضا آئی

نہیں معلوم ہنسے والوں کو رو نے والوں پہ کیا گذرتی ہے
صاف آتی ہے تیری زلف کی بو جب ادھر سے صبا گذرتی ہے

— : 0 : —

بشیر

معتمد بشیر خاں فام ، 'بشیر' تخلص، رام پور کے رہنے والے اور خیمخانہ جاوید جگہ اول کی توتھب کے وقت ساتھہ باسٹھ برس کے تھے۔ سپاہیانہ وضع کے دل دادہ اور خوش باہر آدمی، شاعری کا کمال شوق تھا۔ ابتدائے عمر سے لیلے سخن پر دل نثار کر چکے تھے۔ خیر سے تحصیل نام کی جانب میلان طبع نہ ہوا، لیکن فلموں شنواری و گشتی میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ شعر و سخن سے مذا سبت رکھتے تھے۔ ساتھ ساتھ مشق شاعری بھی جاری رہی۔ نواب نصیح الماک 'داغ' جیسے معاملہ رس و شوخ طبع شاعر کے حضور میں ڈانٹے شکر دی کہ کیا فکر رسا اور تیس بتیس برس کی متواتر و مسلسل مشق نے معقول استعداد شعر کوئی پیدا کر دی۔ واردات قلبیہ اور معاملہ بڑی صفائی سے نظام کرتے ہیں۔ بیان کی روانی اور کلام کی سلاست پر نظر ڈالنے سے یہ نہیں معلوم ہو تا کہ کسی ان پڑہ کے اشعار ہیں۔ بقول لالہ سریرام مؤلف ہزار داستان :-

” بظاہر الف کے نام بے نہیں جانتے مگر مبدع فہماں نے

اس فن میں خاصہ حصہ دیا ہے۔ شعر اچھا کہہ لیتے ہیں اور

یہ نہیں معلوم ہو تا کہ کسی ان پڑہ کا کلام ہے “ —

جن دنوں 'داغ' مرحوم، سرکار رام پور میں اپنے زمزموں سے اہل دربار کو مسرور کر رہے تھے، 'بشیر' کا عالم شباب تھا۔ وہ وقت استاد کی حضوری کے شرف نے آئینہ طبیعت پر صیقل کر دی تھی، تیغ زباں کے جوہر ابھر نے آگے تھے۔

بالمرہ ایک دو غزلیں تصلیف ہو کر شفیق استاد کے ملاحظے میں پیش ہوا کرتیں ۔ حضرت ' داغ ' بھی اپنے اس اُسی شاگرد کے حال پر خاص عنایت و توجہ فرماتے اور غزلوں کو زیور اصلاح سے مزین کرتے وقت پورا لحاظ کرتے —

جہاں یہ سب تھا وہاں بڑی قباحت یہ بھی تھی کہ ' بشیر ' معیشت کی جانب سے مطمئن نہ تھے - اکثر بے روزگاری کی وجہ سے پریشان خاطر رہا کرتے ' شاعری کے لئے جس فراغت و سکون قلب و دماغ کی ضرورت ہے ' وہ انہیں میسر نہ تھا - آخر انہیں مصیبتوں سے تنگ ہو کر حیدرآباد چلے گئے اور وہیں کسی رئیس کی ملازمت اختیار کر کے کچھ نہ کچھ مطمئن ہو گئے - کلام یہ ہے :

گردہ چشم سے کب یہ دل مضطر پھر تا
بت وفا کرتے تو ان سے کوئی کافر پھر تا
یہ لگاوت، یہ کرشمے جو نہ ہوتے تجھ میں
اے صنم کہہ تو خدا سے کوئی کیونکر پھر تا

فقد دل میں نے چھپایا تو برائی کیا کی
کوئی رکھتا نہیں دولت کو تونگر باہر

اُن کا وہ ناز سے کہنا کہ ”عبث رورو کر
پانی کرنا تمہیں خوب اپنا لہو آتا ہے“
دھوم رندوں میں ہے، مجلس سے نکل کر واعظ
آج میخانے میں کرنے کو وضو آتا ہے

تنہا لحد میں چھوڑ گئے آج وہ رفیق
ہوتے نہ تھے جو مجھ سے گھڑی بھر جدا کبھی

وہ چیز تھی شراب کہ اس پر جہاں میں
سب فاتحہ دلاتے جو ہوتی روا کیہی

تیغ قاتل پر گلو مقتل میں رکھ دیں بڑے کے خود
کر دکھائیں آج ہم بھی جو ہمارے دل میں ہے

بتوں کو بے وفا تو نے بنایا، کیا وفا کم تھی
کمی کس کی تھی، کیا شے تیرے گھر میں اے خدا کم تھی
نگاہ غور سے دیکھا تو وہ دونوں برابر تھیں
نہ فرقت تھی قضا سے کم، نہ فرقت سے قضا کم تھی
بنایا آسمان بھی اور اک بہر ستم تو نے
الہی! تیرے بندوں پر بتوں کی کیا جفا کم تھی

— : 0 : —

بنیاد

ان کا نام شیخ بنیاد علی اور 'بنیاد' تخلص ہے۔ شیخ صدیقی۔ قصبۃ الدن
ضاح میرٹھہ کے باشندے اور ایک معزز خاندان کے رکن تھے۔ سارے قصبے میں ان
کا گھرانہ عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور زمینداری پر بسر ہوتی
تھی۔ 'بنیاد' اگلی وضع کے پابند، خلیق، متواضع اور بڑے ہی نیک مزاج
واقع ہوئے تھے۔ انہیں میرے دوست مولوی عبدالباری 'آسی' کی ہم وطنی اور
قربت کا شرف حاصل تھا۔ طبیعت قیز اور فکر رسا پائی تھی۔ قصبۃ الہی
جس کی زمیں مردم خیزی کے لئے مشہور ہے، اسی شاعر بھی پیدا کرنے سے عاری

نہ رہی اور 'بنیاد' جیسی ذہین شخصیت پیدا کی، جس نے بے علمی کے عالم میں اپنی نظمیں الپ کر اہل قصبہ کو صرف معظوظ ہی نہیں بلکہ حیران و ششدر بنا دیا۔ چوں کہ اُن دنوں 'میرٹھہ' اور دہلی سے قریب تر واقع ہوا ہے۔ اس لئے ان ہر دو مقامات کی شاعری سے متاثر ہونا بعید نہ تھا۔ اچھا خاصا اثر ہوا، اُس کی خاک نے اچھے اچھے ادیب و شاعر پیدا کئے —

'بنیاد' کو جب گھر کے دھندوں اور زمینداری کے مشغلوں سے نجات ہوتی تو اہل برادری کی صحبت میں جا بیٹھتے اور اُن مجلسوں کے علمی و ادبی چرچے اُن کی ذہانت و طباطبائی پر جلا کرتے۔ جب ذی اختیار ہوئے تو شباب کے جوش اور ولولے نے غلط راستے پر لگا دیا۔ زندگی کے بیش قیمت اوقات لہو و لعب میں ضائع ہونے لگے "بد کام کا بد انجام" مثل مشہور ہے، افجام کار آبائی زمینداری تلف ہو گئی اور شیخ 'بنیاد' کی شخصیت بہ اعتبار دولت و ثروت ادنیٰ حالت پر پہنچ گئی۔ ادھر خانگی جھگڑوں اور باہمی مذاقشوں نے عاجز و پریشان کرنا شروع کیا۔ خود 'بنیاد' کے صاحبزادے مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور شیخ صاحب کو خدمات و آلام روحانی میں مبتلا ہونا پڑا۔ مصیبت کی گھڑیوں میں جب جذبات و حسیات میں ہیجان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو قدرتاً طبیعت کا رحبان شاعری کی طرف ہو جاتا ہے۔ جوانی کا زمانہ ختم کرنے کے بعد ابتداء شیب میں 'بنیاد' کو شوق شاعری داسن گیر ہوا، چوں کہ "آلا کے راگ" سننے کا بہت شوق تھا اس لئے پہلے پہل اُسی قماش کے دوہے منظوم کئے۔ خود تو ایک حرف بھی لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے جو کچھ کہتے دوسروں سے لکھوا لیا کرتے۔ شوق کی ابتدا تھی، طبیعت ہر وقت حاضر رہتی۔ عالم شباب کی گرم جوشیاں تو سرد پڑ چکی تھیں، غارت گرو تہا کن اشغال کا سلسلہ بالکل قطع ہو گیا تھا، اب یا تو خانگی کام کام دل بھلانے کا ذریعہ تھے یا ایلانے سخن مونس و مساز زندگی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں دوہوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اُس زمانے میں

’آسی‘ نو عمر تھے لیکن شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ شعر و سخن کی بساط بچھی تھی اور مضامین تازہ و بتازہ کی چالیں چلی جا رہی تھیں۔ بنیاد کو ’آسی‘ سے بزرگانہ معیت تھی اکثر اُن کے یہاں نشست رکھتے، اپنے دوہے سناتے اور اُن کے اشعار سنتے۔ لطف یہ کہ ان موقعوں پر خوردی و بزرگی کا امتیاز بالائے طاق رکھ کر بے تکلف دوست کی طرح داد کلام دیتے اور نذرانۂ تحسین قبول فرماتے۔ اگرچہ ’بنیاد‘ سن و سال میں حضرت ’آسی‘ سے بہت بڑے تھے لیکن شوق سخن ساتھ ساتھ شروع ہوا تھا۔ درمیان سے تکلفات کا پردہ اٹھا دیا تھا۔ اس نشست و برخاست کا یہ نتیجہ نکلا کہ ’بنیاد‘ کی طبیعت نے پلٹنا کھایا ’دوہے‘ اشعار اور ’لاونیاں‘ غزلوں کی صورت میں تبدیل ہونے لگیں۔ خصوصاً اس دلچسپ مشغلے نے اس وقت اور ترقی کی جب شیخ ’بنیاد‘ نے اپنے فرزند سے کبیدہ خاطر ہو کر علیحدگی اختیار کر کے اپنی اہلیہ کے ساتھ جناب ’آسی‘ کے ہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے انتقال کو چند سال ہوئے۔

ترتیب تذکرہ کے وقت جناب ’آسی‘ نے ان کے یہ حالات بیان فرمائے تھے جو ناظرین کے سامنے پیش کیے گئے۔

ان کے کچھ اشعار جناب ’آسی‘ کو یاد تھے جو تہرکاً درج ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری معمولی تک بندی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ نہ تو خوش گویان دہلی کی طرح کلام میں سلوفا پن ہے نہ زبان کا چٹھارا۔ حسن تخیل تو بہت دور ہے۔ ہاں دیہاتی اکھڑ پن ہے جس نے ظرافت کے بدلے اشعار کو مضحک بنا دیا ہے۔ تاہم ایک اُن پرے شاعر کی تک بندی بھی کچھ توجہ کی مستحق ہے۔ الحال سارے تین شعر ’بنیاد‘ کی کائنات سخن ہیں :-

فاراضی مجھ سے فیر بھی دشمن ہیں اپنے بھی
دھوبی کا گُٹا ہوں، نہ میں کھر کا نہ کھات کا

حسنِ فطرت

حسنِ جلباب عدم سے جو درخشاں نکلا
 وجد میں کون و مکان بیخود و رقصاں نکلا
 ہے جہانگیر ضیا پاشے حسنِ تکوین
 اب تو ارمانِ ترا عالمِ امکان نکلا ؟
 ہے حظوظِ دل و روح بشریت اس میں
 حسن کی بزم سے کوئی نہ پریشان نکلا
 موقعِ حیرت کا نہیں یہ تو ہے خوشِ مستی کا
 کام تجھ سے نہ کوئی دیدہ حیراں نکلا
 ہے عدد و ذہنیت خلق کا رفیع اور ملال
 قیدِ اندوہ میں پھنس کر کوئی انسان نکلا ؟
 جو سمجھتا ہے کہ انسان ہے ضعیف البدیان
 ذہن سے اُس کے نہ اندیشہٴ شیطان نکلا
 حسن کو جس نے دو روزہ کہا ۔ کوتاہی تہا
 اُس کے سینے سے نہ خارِ غمِ مصیباں نکلا
 گوئی و گردن نے جو پھیلائے ترے دستِ سوال
 لعل و الماس سے پُر کوا کا دامن نکلا

ہارشی زیب گلے کا جو ترے ہار ہوئی
 بحر سے سلسلہ گوہر غلطان نکلا
 حسن فطرت سے ہے افسان کی حسن آرائی
 غارۂ و عطر کا گل بوٹے سے سامان نکلا
 ہے شرابور سے حسن سے عالم کی فضا
 اس کا گلشن ہی نہ اک بندۂ احسان نکلا
 برق کا ہے وہ تبسم کہ ہے وہ خندۂ گل
 حسن ہر رنگ میں، ہر شان میں رخشاں نکلا
 حسن کا ہے یہ و فور، اس کو فہ کہہ دلتنگی
 رنگ بھی سینے سے غنچے کے پر افشاں نکلا
 درۂ التاج سعادت ہے پر ستاری حسن
 نفس کا لوت ہی برہم زن ایہاں نکلا
 پرت کا ہے یا ہے گل و برگ گلین
 حسن ہر رنگ معین سروسامان نکلا
 ہے گل حسن سے لہریز یہ دنیا، کیفی !
 نظر قاب کا بھی تنگ ہی دامان نکلا

 (۲)

زمانہ یہ نہیں ماضی کی داستان کے لئے

نسیم باغ ارم ہے صبا! جہاں کے لئے
 نہیں وہ روح رواں صرت گلستاں کے لئے

ہے مہر و ماہ کا فیض ایک سا ہر اک شے پر
 یہ راہ بات کے دیوے ہیں گل جہاں کے لئے
 زباں بنی ہے ہشاشت کا راگ گانے کو
 نہ داستان غم و حسرت و فغاں کے لئے
 ڈھلنگے دیدل 'چھوڑ کر یہ' رہ آئندہ
 ہے سرمہ خاک الم چشم خوں فشاں کے لئے
 تو مست کھا کے ہے پھل اور سونگھ کر یہ پھول
 نہ تھے مزے یہ مشام اور فقط وہاں کے لئے
 ہو نور حسن جو دل میں تو ہر نفس تیرا
 شہیم باغ جناں ہو مشام جاں کے لئے
 سمجھ کے زیست دو روزہ کہوں ہوا مایوس
 جہاں ہے تیرے لئے اور تو جہاں کے لئے
 جو موت آنی ہے، آکر رہیگی اپنے آپ
 تو پالتا ہے یہ کیوں روگ اپنی جاں کے لئے
 شباب جیسے کہ بچپن کے بعد لا بد ہے
 اسی طرح ہے بڑھا پا بھی ہر جوان کے لئے
 بنی ہے تیری ہی خاطر تو ساری موجودات
 زمین کا لقمہ نہ تو جوڑ آسماں کے لئے
 جو کائنات کا خلاق ہے خدا تیرا
 تو دل میں آگ نہیں کیوں ہر افس و جاں کے لئے
 ہے وقت، حل ہو معنائے حال و استقبال
 زمانہ یہ نہیں ماضی کی داستان کے لئے

یہاں جو ہے اُسے پہنایا یہ چھوڑتا کیوں ہے
 کیا یہاں کا ہی کام آئیگا وہاں کے لئے
 نہیں ہے تجھ میں جو ایثار اور جاں بازی
 تو منہ اُٹھائے چلا کیوں ہے امتحان کے لئے
 ہو جس میں حوصلہ وہ تکتا ہے یہ ساغر
 ہے ظرافت کی بھی ضرورت تھے مٹانے کے لئے
 اٹل ہے عزم ہی تیرا نہ حوصلہ ہی بلند
 مڑے کس لئے پھر تو نے آسمان کے لئے
 رہیں بخت کا اختر بھی اوج پر ہوگا
 بھیکے اور ستارے جب آسمان کے لئے
 قوی دلوں کو ہے میدان امتحان دنیا
 تھا شا کا ہے اک قلب نا توان کے لئے
 وہ آئیں بزم محل میں جو کام کے ہیں لوگ
 جگہ، نہیں یہ تھا شائی، نوحہ خواں کے لئے
 تسلی رکھ، ابھی تو کش ہے آیا چٹکی میں
 جو تیر چاہئے اس سیف تپان کے لئے
 جو حوصلوں کو اُبھارے وہ جذب شان قلم
 اُجالے قلب کو یہ شرط ہے یہاں کے لئے
 تو کیا غراہت و تعقید نے کے بیٹھا ہے
 دلوں پہ قبضہ ہی معراج ہے زبان کے لئے
 غزل نے پائی ہے، کیفی! قلمی قرالی شان
 یہ ظرافت تنگ نہیں ہے مڑے بیاں کے لئے

مقی مہ چمنستان شعرا*

(از ادیٹر)

راے لچھمی فرائن تخلص 'شفیق' و 'صاحب' کے والد راے منسارام نواب نظام الہاک آصفجاہ مرحوم کے عہد میں پیشکار صدارت شش صوبہ دکن تھے۔ راے منسارام اپنی ایک کتاب† کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ”بلدہ عقیدت شناس منسارام آصفجاہی ابن بھوانی داس غازی الدین خانی، فبیرہ بال کشن عابد خانی نے تھمبنا مدت پچاس سال اس سرکار دولت مدار میں اپنی زندگی بڑی اچھی طرح بسر کی، صدارت کل کی خدمت انجام دی اور مورد عاطفت و شفقت رہا۔“ —

'شفیق' کھتری قوم سے تھے اور ان کے بزرگ لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا بھوانی داس لشکر عالمگیری کے ہمراہ دکن میں آئے اور اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ راے منسارام کو صغر سنی ہی میں یتیمی کا داغ نصیب ہوا۔ سن شعور کو پہنچ کر ایسی لیاقت حاصل کی کہ نواب مغرت مآب آصف جاہ اول کے عہد میں پیشکار صدارت صوبجات دکن کی خدمت پر فائز ہو گئے۔ منسارام چار پشت سے خاندان آصف جاہ کے نمک خوار تھے —

راے منسارام محض دفتر کے پیشکار یا سررشتہ دار ہی نہ تھے بلکہ تاریخ و

* یہ کتاب حال ہی میں انجمن ترقی اردو نے نہایت اہتمام سے شایع کی ہے۔ اور قابل دید ہے حجم تقریباً ۶۰۰ صفحہ —

† شام فرہبان، باب آخر — ‡ مآثر نظامی —

افشا کا بھی ذوق رکھتے تھے اور صاحب تالیف و تصنیف ہوئے ہیں۔ ایک کتاب اُن کی 'مآثر فطامی' ہے۔ یہ کتاب اُنہوں نے اُس زمانے میں لکھی تھی، جب ناموافق حالات کی وجہ سے خانہ نشینی ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں فواب نظام الملک آصف جاہ اول کے حالات ہیں۔ ابتدا میں ان کے بزرگوں کا بھی تذکرہ آگیا ہے۔ یہ حالات کچھ تو مصنف کے چشم دید ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ثقافت سے معلوم ہوئے، اور بعض حالات خود فواب آصف جاہ مرحوم کی زبان مبارک سے سنئے میں آئے۔ یہ کتاب ۱۲۰۰ھ میں مرتب ہوئی۔ اور جب اُنیس سال کی گھنٹا کی اور گوشہ نشینی کے بعد "حضرت مرشد زادۃ آفاق مہین پور خلافت و ریاست فواب عالی جاہ بہادر اسد جنگ" نے یاد فرمایا تو یہ رسالہ بطور تحفہ حضور میں پیش کیا۔ ان کی دوسری تالیف "قانون دربار آصفی" ہے۔ یہ کتاب بھی زمانہ گوشہ نشینی کی لکھی ہوئی ہے۔ سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ ہے۔ اس میں ضوابط دربار کے علاوہ بعض بعض بڑے کام کی باتیں بھی آگئی ہیں۔ مؤلف نے آخر میں لکھا ہے کہ یہ کتاب میں نے دو روز میں لکھی —

اس سے یہ معلوم ہوگا کہ 'شفیق' ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، جہاں علمی چرچا تھا اور خود اُن کے والد صاحب تالیف و تصنیف تھے۔ 'شفیق' کی ولادت سنہ ۱۱۸۵ھ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی ہندوستان سے لے کر دکن تک ریختہ گوئی کی گرم بازاری ہے اور منجملہ دوسرے شہروں کے اورنگ آباد بھی مرکز شعر و سخن بنا ہوا ہے۔ اگرچہ اس وقت ذرائع آمد و رفت کی یہ آسانیاں نہ تھیں جو اس وقت ہیں، لیکن اس پر بھی شمال کے اساتذہ کا تازہ کلام یہاں پہنچتا رہتا ہے، بڑے اشتیاق سے پڑھا جاتا ہے اور مشہور خاص و عام ہو جاتا ہے، جس سے صاحب ذوق لوگوں کے دلوں میں نئی نئی اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ان باکمال اساتذہ کی تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں —

'شفیق' کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق فارسی، عربی، صرف و نحو، انشا وغیرہ میں ہوئی اور جیسا کہ خود اُنہوں نے اس تذکرے میں لکھا ہے، شیخ عبدالقادر صاحب

سے کتب متعارفہ کی سند حاصل کی۔ بدوسن شعور ہی سے ان میں شعرو سخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ میر غلام علی 'آزاد' بلگرامی جن کا شمار ہندوستان کے جید علما میں ہے اور جو فن شعر گوئی اور تاریخ میں ید طولی رکھتے تھے، دکن ہی میں تھے۔ 'شفیق' کو ان سے تلامذہ کا شرت حاصل ہوا۔ لکھتے ہیں کہ "میر عبدالقادر 'مہربان' نے جو حضرت 'آزاد' کے تلامذہ ہیں سے تھے، مجھے "صاحب" تخلص عذایت فرمایا۔ غزلیات کا دیوان جس میں تقریباً دو ہزار بیت تھے، مرتب کیا۔ لیکن جب ذرا استعداد بڑھی اور اصطلاح شعرا اور قواعد شعرا میں مہارت حاصل ہوئی تو اُسے تقویم پارینہ سمجھ کر فطر انداز کر دیا۔ اب کہ میری عمر اٹھارہ سال کی ہے، مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب میر محمد مسیح کا تخلص فارسی میں 'صاحب' ہے تو میں نے "مہر صاحب و قبلاہ" (آزاد بلگرامی) سے تخلص کی التجا کی۔ آپ نے ازراہ شفقت "شفیق" تخلص عطا فرمایا۔ چونکہ میرے ریختے عوام و خاص میں مشہور ہو چکے تھے، اس لئے ریختے میں "صاحب" ہی تخلص رہنے دیا اور جن بحروں میں "شفیق" نہیں کہہ سکتا وہاں ناچار "صاحب" ہی رکھنا پڑا۔ اس لئے تخلص کی خوشی اور شکر یہ میں وہ ایک قطعہ موزوں کرتے ہیں اور "تخلص نوی" اس کی تاریخ نکالتے ہیں۔ مہربان، شفیق کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ان کے حالات میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔

میر غلام علی 'آزاد' ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۰ ع) میں اورنگ آباد وارد ہوئے اور بابا شاہ مسافر کے تکیے میں قیام کیا اور سات سال یہیں بسر کر دئے۔ 'آزاد' کی عمر کے اڑتالیس سال دکن ہی میں گزرے اور یہیں وفات پائی اور خلد آباد میں پیوند زمیں ہوئے۔ آپ کے فیض صحبت سے دکن کے اکثر باکمال مستفیض ہوئے۔ انہیں میں 'شفیق' تھے۔ 'شفیق' کو 'آزاد' سے کہاں مقیدت مندی تھی اور جہاں کہیں ان کے تالیفات میں 'آزاد' کا نام آیا ہے تو اُن کا ذکر بڑے ادب و احترام اور

خلوس و ارادت سے کرتے ہیں اور ہر جگہ افہییں ”میر صاحب قبلہ“ ”پیر و مرشد“ یا قبلہ و کعبہ برحق“ اور اپنے آپ کو ”غلام“ لکھتے ہیں۔ (غالباً اس میں ’آزاد‘ کے لفظ کی رعایت بھی ملحوظ ہے)۔ ’گل رعنا‘ میں ’آزاد‘ کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے کلام میں جا بجا حضرت کے کہاں اور اپنے تعلقات و عنایات کا ذکر کیا ہے۔ ایک پر زور قصیدہ اُن کی مدح میں لکھا ہے:—

للہ الحمد صبا۔ زوۃ عشرت لائی کہ بہار اب کے تجمل سے چمن میں آئی
شاہ کل تخت چمن پر ہے بصد زینت و ناز سرو و ششہاد ہیں استادہ وہاں مجرائی
بہار یہ تشبیہ کے بعد گریز کی ہے:—

طابع حضرت سے مگر وام کرے رنگینی اب جر کرتی ہے بہار ایسی چمن آرائی
یعنی وہ حضرت ’آزاد‘ کہ خورشید و قمر آستان اُس کی پہ رکھتے ہیں جبیں فرسائی
قبلہ ہر دو جہاں ’مرشد‘ ارباب سلوک ختم ہے ذات مبارک پہ کرم فرمائی
علم منقول میں اُس کو دم عیسیٰ ہیگا عالم معقول میں اُس کو ہے ید بیضا ئی
قہریان عرب اُس کی ہیں ثناخوانی میں عند لبیان عجم کی ہے سخن پیرائی
بسکھر کھتا ہے سخن بیچ و شیریں کاری ہند کے طوطیوں کو اُس سے ہے شکر خائی
نکہ لطف مرے پر ہے ہمیشہ مہذول معجو زیبا ہے غلامی، اُسے ہے آقائی

اس کے بعد دعا ہے اور دعا کے بعد یہ مقطع ہے:—

فارسی شعر کہو مدح میں اُس کی ”صاحب“ کہ ملے تجکو خطاب ملک الشعرائی
اسی طرح ایک پوری غزل ’آزاد‘ کی شان میں کہی ہے۔ غزل کیا ہے ’گویہ

اپنے پیر و مرشد کی شان میں چھوٹا سا قصیدہ ہے:—

سرور ہو دو جہاں آزاد ہے والی کون و مکاں آزاد ہے
کنت کنزاً کے معافی پر خبر واقف سر نہاں آزاد ہے
مرکز ادوار چرخ چنبری قطب الا قطاب زماں آزاد ہے

اسم اعظم ہے زباں زد اس کے تئیں جس کے تئیں ورد زباں آزاہ ہے
 خورد و بزرگ کے تئیں یہاں ہے رسوخ مرشد پیر و جواں آزاد ہے
 ایک دم میں دین و دنیا بخش دے جس کے اوپر سہر باں آزاد ہے
 دل سے اب 'صاحب' ہوا ہے کا غلام بادشاہ انس و جان آزاد ہے
 کہاں تک لکھوں، 'شفیق' کی عقیدت کے اظہار کے لئے یہ بہت کافی ہے۔
 حضرت آزاد کا ذوق سخن محتاج بیان نہیں، ایسے صاحب ذوق اور
 باکمال لوگ کم ہوتے ہیں۔ ان کا کلام اور ان کی تصنیفات اس کی شاہد
 ہیں۔ اس کے ساتھ تاریخ و سیرت کا ذوق بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ ان کے
 تذکرے اس فن کے بہترین نمونے ہیں۔ 'مآثر الامرا' جو تاریخی لحاظ سے
 بے مثل کتاب ہے، انہیں کے فیض اثر کا نتیجہ ہے، بلکہ بہت کچھ حضرت 'آزاد' ہی
 کی قلم کی مہنوں ہے۔ ادب میں ان کی نظر بہت وسیع تھی اور تحقیق و
 تلاش میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اچھا استاد دنیا کی بہترین نعمتوں
 میں سے ہے۔ 'شفیق' بڑا خوش قسمت تھا کہ اُسے 'آزاد' سا استاد ملا۔ اس نے
 بھی استاد کے قدم بقدم چلنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ شاعر تو وہ لڑکپن
 سے تھا، فارسی اور اردو دونوں میں اس کا کلام موجود ہے اگرچہ کم یاب ہے۔ اس
 کے علاوہ اس کی تصنیفات و تالیفات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو شعرا کے تذکرے
 اور دوسری تاریخی کتابیں۔ یہاں ان تالیفات کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے۔

تاریخ

————— (حقیقت ہائے ہندوستان) —————

'شفیق' اس کتاب کی حقیقت دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں

* اس مقدمے میں رائے منسارام اور 'شفیق' کی تالیفات کا ذکر آیا
 ہے، ان میں سے تلمیذی شگرف، حالات حیدرآباد، دیو کی فہرست سے ماخوذ ہیں،
 باقی کتابوں میں سے موجود ہیں۔

کہ ” راقم کے والد راے منسارام نے جو چار پشت سے نمک خوار خاندان آصفی ہیں - سنہ ۱۲۰۴ھ میں اورنگ آباد سے فردوں کے چند طباق میرے پاس حیدرآباد بھیجے - یہ میرے جد ماجد کے لکھے ہوئے تھے ، جو سرکار حضرت کلاں علیہ المغفرۃ والراضون میں خدمت مستوفی کری اور پیشکاری صدارت امکنہ ہندوستان پر فائز تھے ، یہ فردیں نواب مغرت مآب نظام الملک کے دستخط سے مزین تھیں - لیکن ان میں سے بعض بو سیدہ ہو گئی تھیں اور اکثر کرم خوردہ تھیں - ان فردوں میں قدیم زمانے کے مختلف سنیں سے سنہ ۱۱۳۹ ت تک کے مداخل و مخارج و جمعیت سپاہ وغیرہ کا حساب بطور سیاق و اصطلاح اہل جراثد میں درج تھے - ان سب کو سادہ عبارت میں تحریر کیا اور رقمی اعداد کو الفاظ میں لکھا اور اس کے علاوہ دوسری معلومات بھی فراہم کر کے مناسب مقامات پر اضافہ کیں —

یہ کتاب ’ شفیق ‘ نے اُس وقت کے رزیدنت اور اپنے سرپرست کپتان ولیم پیٹرک کے لئے تالیف کی - کتاب کے نام سے اس کا سنہ تالیف (۱۲۰۴ھ) نکلتا ہے ، اس میں چار مقالے ہیں : —

مقالہ اول میں دفتر قدیمہ کی فردوں کی کیفیت ہے —

مقالہ دوم میں صوبہ ہائے ہندوستان کا حال ہے —

مقالہ سوم میں صوبجات دکن کا ذکر ہے —

مقالہ چہارم میں مسلمان سلاطین ہند کا مختصر حال ، سلطان معزالدین

سام سے لے کر شاہ عالم بادشاہ تک ہے —

یہ کتاب اچھی ضخیم ہے اور اس میں ہر سرکار پرگنہ اور حویلی کے مداخل اور

سمت اور فاصلہ درج ہے - ضمنی طور پر مختصر تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں -

فرض یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے —

— (تنہیق شگرت) —

یہ بھی دکن کی تاریخ کے متعلق ہے۔ مختلف صوبوں کے جغرافی اور تاریخی حال اور اعداد و شمار ہیں اس کے بعد سلاطین بہمنیہ کا ذکر ہے جو تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ہے۔ سلطنت بہمنیہ کے زوال پر جو حکومتیں قائم ہوئیں (یعنی عادل شاہی، نظام شاہی، عہاد شاہی، قطب شاہی، برید شاہی، اور خاندیس کے فاروقی سلاطین) اُن کا مختصر حال ہے۔ آخر میں سلاطین تیہوریہ کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ھ تک ہے۔ یہ نام بھی تاریخی ہے، جس سے سنہ تالیف ۱۲۰۰ھ نکلتا ہے۔ یہ کتاب حیدرآباد کے رزیدنت مسٹر رچرڈ جانسن کے فام معنون ہے —

— (مآثر آصفی) —

یہ خاندان آصف جاہ کی تاریخ ہے، یعنی خواجہ عابد (نظام الملک آصف جاہ اول کے دادا) سے لے کر آصف جاہ ثانی تک کے حالات ہیں، مرہٹوں نے جو ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس کا بھی ذکر ہے۔ فیض اس زمانے کے امرا اور راجاؤں کے حالات بھی لکھے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۰۸ھ میں تالیف ہوئی —

— (بساط الغنائم) —

یہ مرہٹوں کی تاریخ ہے۔ اور یہ کتاب اس نے سر جان ملکم کی فرمائش سے لکھی، جو اس وقت حیدرآباد میں تھے، اس میں مرہٹوں کی تاریخ ابتدا سے مؤلف کے وقت تک کی ہے۔ اس کا ایک حصہ ' شفیق ' نے کسی مرہٹی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے۔ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۱۳ھ نکلتا ہے —

— (حالات حیدرآباد) —

اس میں بلوچ حیدرآباد کی مساجد، معلات و باغات اور شہر کی مختصر تاریخ ہے، بیدر اور ورنکل کے حالات بھی درج ہیں۔ یہ کتاب بھی سنہ ۱۲۱۳ھ کی تالیف ہے —

تذکرے

— (شام غریباں) —

یہ تذکرہ اُن ایرانی شعرا کا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ نام بھی مضمون کی مناسبت سے رکھا ہے۔ اگرچہ حالات بہت مختصر ہیں، مگر کتاب دلچسپ ہے اور اشعار کا انتخاب خوب ہے۔ لطائف و ظرائف سے خالی نہیں۔ بعض بعض جگہ اشعار کے متعلق خاص نکات بھی بیان کر دیے ہیں۔

— (گل رعنا) —

یہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، اس میں وہ ایرانی نژاد بھی ہیں جن کے باپ دادا ہندوستان میں آئے اور یہیں رہ گئے اور ہندی نژاد بھی۔ اس میں دو فصائل ہیں: ایک میں ”شعراے اسلامیاں“ کا اور دوسری میں ”نکتہ پردازان اصنامیاں“ کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ ”شام غریباں“ سے بہت بڑا ہے، اور اکثر حالات بھی مفصل بیان کئے ہیں۔ اپنے استاد ’آزاد‘ بلگرامی کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ ’اکبر‘ کا حال کوئی ۴۶ صفحوں میں ہے، مگر سب ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ افسوس کہ ’شفیق‘ نے اس میں تحقیق سے مطلق کام نہیں لیا۔ وہ اس مورخ کے ادعائے راست گوئی کو اس کے جذبات تعصب و حسد و رشک سے جدا نہ کر سکے۔ علامہ ’فیضی‘ کے حالات بھی بلا کم و کاست بدایونی سے نقل کر دیے ہیں۔ ’شفیق‘ بدایونی کو بالکل نہیں سمجھے۔

’شام غریباں‘ کے مقابلے میں اس تذکرے میں تاریخی واقعات اور لطائف و ظرائف بھی زیادہ ہیں۔ بعض بعض مقامات پر اشعار کی شرح بھی کر دی ہے اور ان کے نکات بھی بتادیے ہیں۔ مثلاً میر محمد افضل الہ آبادی ’ثابت‘ کے ایک قصیدے میں کثرت سے طبی تلمیحات و اصطلاحات ہیں، اس کے اشعار نقل

کر کے ان تھام تلمیحات و اصطلاحات کی شرح لکھی ہے۔ اسی شاعر کا ایک دوسرا معرکے کا قصیدہ ہے، اس کا انتخاب درج کیا ہے اور اس کے مشکل مقامات کا حل بھی لکھ دیا ہے۔ یہ تذکرہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

— (چمنستان شعرا) —

یہ ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ 'شفیق' لکھتے ہیں کہ "جب ہندوستان سے تازہ تازہ میر محمد تقی 'میر' اور فتح علی خاں کے تذکرے پہنچے تو سارے عالم میں غلغلہ مچ گیا اور اشعار ہند کے اشتیاق میں ایک دنیا تہ و بالا ہو گئی، کیونکہ اہل دکن کو ان اشعار کا بہم پہنچنا دشوار ہے۔ اس لئے میری فکر ناقص میں یہ بات آئی کہ ان دونوں تذکروں کے اشعار لوں اور دوسرے جواہر پارے ان کے ساتھ ملا کر ایک سفینہ تیار کروں۔ اس تقریب سے بعض احباب سخن داں کے حالات و کلام کے جمع کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ دوست احباب نے بھی اس کی تائید کی بلکہ اصرار کیا اور میں اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔"

'شفیق' نے اس تذکرے کی ترتیب میں عجیب جدت دکھائی ہے۔ اب تک جتنے فارسی اردو کے تذکرے لکھے گئے ہیں (سوائے میر صاحب کے تذکرے کے، جس میں کوئی ترتیب نہیں) ان میں ناموں کی (یعنی تخلصوں کی) ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے، لیکن 'شفیق' نے اس تذکرے کی ترتیب حروف ابجد یعنی حساب جمل کے لحاظ سے رکھی ہے۔ اس میں کوئی خاص خوبی نہیں معلوم ہوتی، نہ خود مؤلف نے اس کی کوئی وجہ بتائی ہے۔ سوائے اس کے کہ جوانی کی طرف کھا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

جوانی کا زمانہ ہے، صبارت میں رنگینی پائی جاتی ہے، بعض اوقات تشبیہات و استعارات میں باتیں کرتے ہیں۔ جہاں کہیں موقع ملتا ہے، شاعر کے تخلص یا اس کے پیشے وغیرہ کی مناسبت سے اُسی قسم کے الفاظ اور تشبیہات

میں اس کا حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں (مثلاً ملاحظہ ہوں : آشنا ، آوارہ ، بہار ، داؤد ، خاکسار ، زکی ، معبد علی حشمت ، مخلص ، ناطق وغیرہ کے حالات) لیکن عبارت گنجلک نہیں ، بیان صاف اور شستہ ہے اور زبان پر قدرت ہے ۔ کہیں کہیں میر صاحب (میر تقی) کی طرح اصلاح بھی دے دیتے ہیں ۔ یا شعر میں کوئی کنایہ یا خاص نکتہ ہوتا ہے تو اُس کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں ، جس سے ، شفیق ، کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا اندازہ ہوتا ہے —

اگرچہ ، شفیق ، نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں پر رکھی ہے لیکن ان کے علاوہ جہاں جہاں سے جو جو حالات مل گئے ہیں حوالے کے ساتھ اُن کا بھی اضافہ کر دیا ہے ۔ چنانچہ کتاب کے مطالعے میں بعض جگہ شاہ عبدالعظیم ، حاکم ، کے تذکرے ، مردم دیدہ ، اور تذکرہ ، مجمع النفاث ، تألیف سراج الدین خان آرزو ، سرو آزاد ، اور حاجی علی ، اکبر ، رتال اور رضا خان ، انوار ، کی بیاضوں کا حوالہ ملے گا —

بعض اوقات اشعار کے متعلق مغالطہ ہو جاتا ہے اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اشعار خصوصاً مشہور اشعار مختلف شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں ، شفیق ، نے اس باب میں بڑی احتیاط اور تحقیق سے کام لیا ہے ۔ جن اشعار کا پتا نہیں چلا وہ تذکرے کے آخر میں جمع کر دے ہیں کہ ان کا پتا چلانا دشوار ہے ، خصوصاً اہل دکن کے لئے ، کیونکہ ایک ہی تخلص کے کئی کئی شاعر ہیں ۔ ہندوستان سے اشعار اکثر صرف تخلص کے ساتھ آتے ہیں ۔ اور نادان پڑھنے والے سب کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ شعر حقیقت میں کس کا ہے —

، شفیق ، ہر شاعر کے تذکرے میں انصاف کو ملحوظ رکھتا ہے اور کبھی کسی پر ناگوار نکتہ چینی نہیں کرتا ۔ چنانچہ ، یقین ، کے بیان میں خود لکھتا ہے کہ ” جب کسی شاعر کے کلام میں کوئی ثقیل مصرع نظر پڑا تو خود ایک

دوسرا مصرع لکھ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ یہ مصرع بھی خوب معلوم ہوتا ہے۔ ”اپنے مصرع کو ترجیح نہیں دی، بلکہ پڑھنے والے کی پسند پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن ’یقین‘ کا تذکرہ مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔ اس میں اس نے اس قدر مبالغے بلکہ غلو سے کام لیا ہے کہ خلاف عادت ’شفیق‘ کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا، وہ اسے اردو کا سب سے بہتر شاعر خیال کرتا ہے اور ہندو دکن میں کسی کو اس کی تکر کا نہیں سمجھتا۔ کہتا ہے کہ ”اگرچہ میرزا سودا کا غزل، رباعی، مخمس، مثنوی، قصیدے، قطعہ بند وغیرہ میں بڑا رتبہ ہے، اور وہ بہت عالی تلاشی کرتے ہیں، لیکن ’یقین‘ کے ریختے میں کچھ اور ہی فصاحت و ملاحت ہے:-

اگر ہزار برس تک یہ میرزا ’سودا‘
کرے جو فکر تتبع یقین، کا از دل و جاں
کہے گا معنی باریک و خوب و شیریں تر
ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں؟

وہ یکتائے عصر اور یگانہ زمانہ ہے اور ایسا معنی آفریں اور نکتہ رس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ ”میر صاحب نے اپنے تذکرے میں جو ’یقین‘ پر طعن و تعریف کی ہے اور اسے ”متبدل بند“ کہا ہے اور سرقے کا الزام لگایا ہے تو اس پر ’شفیق‘ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور میر صاحب کو خوب سخت سست کہتا ہے، ’سودا‘ نے جو میر صاحب کی ہجو کہی تھی، اسے نقل کر کے اُس کی داد دیتا ہے۔ اس کے بعد ’توارد‘ و ’سرقہ‘ پر بعض کی ہے، دوسرے علما کے اقوال نقل کئے ہیں اور خود اپنا قطعہ بھی جو اس مضمون پر لکھا ہے نقل کیا ہے۔ غرض میر صاحب کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے اور خود میر صاحب کے ذکر میں بھی اُن کی حوت گہری پُر چوت کی ہے۔

غرض 'یقین' کی شاعری کا بہت بڑا مداح اور معتقد ہے اور اُس کی تقلید کو فخر سمجھتا ہے۔ اپنے کلام میں کہیں کہیں اس کا اشارہ کیا ہے۔ مثلاً ایک غزل کا مقطع ہے :

دیوان 'یقین' خواہ خط 'صاحب' نے لکھا یا ہے

اور ان طلائی پر کھینچی ہیں کی تحریریں

یقین کا تذکرہ اور کلام تقریباً ۶۴ صفحوں میں درج ہے۔ اسی سے قیاس

ہو سکتا ہے کہ وہ اس شاعر کو کیسا سمجھتا تھا —

حاجی میر علی اکبر رمال 'حاجی' سے 'شفیق' نے رمل وغیرہ کی تحصیل کی تھی۔ 'حاجی' کے تذکرے میں خود بقی اپنے اظہار کمال کے لئے ایک زائچہ دیا ہے جس سے عام ناظرین کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی، اسے ایک نوجوان طالب علم کا شوق نہوہ و نہائش سمجھنا چاہئے —

'شفیق' کا تذکرہ میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں سے بڑا ہے اور بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ درج ہے جو ان دونوں میں نہیں پایا جاتا۔ بہت سے ایسے ہیں جو 'شفیق' کے ہم عصر ہیں اور جن سے اس کی ذاتی ملاقات ہے اور خود ان شاعروں سے اُن کا منتجب کلام لے کر درج تذکرہ کیا ہے۔ ایسے حالات خاص طور پر قابل اعتبار ہیں —

سب سے قابل تعریف بات یہ ہے کہ 'شفیق' نے یہ تذکرہ ۱۸ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور بغیر کسی کی مدد کے بہت تھوڑے عرصے میں ختم کر دیا۔ اس عمر میں ایسی اچھی کتاب کا تالیف کرنا اعجاز سے کم نہیں، اس سے 'شفیق' کی غیر معمولی ذہانت اور ایماقت معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کا نام "چمنستان شعرا" تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۷۵ھ سن تالیف نکلتا ہے —

جہاں تک تحقیق کیا گیا، اس تذکرے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے جو کتب

خانہ آصفیہ سرکار عالی حیدر آباد میں ہے اور یہ بھی کرم خوردہ، فرسودہ اور

مشکوٰۃ ہے۔ یہ اسی فسختے کی نقل ہے۔ اس کی تصحیح میں بیحد دقت اُٹھانی پڑی، بعض عبارتیں اصل کتب سے، جو اس کا ماخذ ہیں، صحیح کرنی پڑیں، کہیں قیاس سے کام لینا پڑا اور بعض بعض مقام پر کچھ الفاظ جو کتاب کے ازلی کپڑے چٹ کر گئے ہیں، ویسے ہی چھوڑنے پڑے اور اُن کی جگہ نقطے دے دیے ہیں، بہت سے اشعار جو تذکرے میں مشکوٰۃ یا کرم خوردہ تھے، شعرا کے اصل دیوانوں سے تلاش کر کے لکھے گئے۔ بعض الفاظ جو مشتبہ تھے اور ان کی صحت نہ ہو سکی، ان کے سامنے استفہام کی علامت لکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئی ہوں، اگر دوبارہ اشاعت کی فوبت آئی تو جہاں تک ممکن ہو اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔

ایک کام اس کی ترتیب میں اور کیا گیا ہے، جسے غالباً فاظرین پسند فرمائیں گے، یعنی، 'تحفة الشعراء'، تالیف افضل بیگ خان قاقسال اورنگ آبادی (سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ) سے اُن ریختہ گو شعرا کا حال اور کلام جو 'شغیق' کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں حاشیے میں درج کر دیا ہے۔ جن جن شاعروں کا اس میں اُردو کلام نہیں وہاں صرف حالات ہی لکھ دیے گئے ہیں اور جہاں حالات میں کوئی نئی بات نہیں ہے وہاں صرف کلام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مشترک کلام ہر جگہ خارج کر دیا گیا ہے۔ بعض شاعر ایسے بھی ہیں، جن کا ذکر 'چمنستان' میں نہیں ہے، اُن کا حال اور کلام ہر حرف کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کو ضرور بصیرت ہو گی اور وہ 'تحفة الشعراء' کے مطالعے سے مستغنی ہو جائیں گے۔ یہ تذکرہ 'چمنستان' سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اصل میں یہ تذکرہ فارسی کو شعرا کا ہے، اس میں ضمناً ایسے شعرا بھی آگئے ہیں جو اُردو میں بھی شعر کہتے تھے بعض شعرا کے حالات اس میں کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔

— (شفیق کا کلام) —

‘شفیق‘ کے اُردو کلیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پر گو شاعر تھا ، زبان پر قدرت تھی اور شاعری کے نکات سے خوب واقف تھا۔ اور اس کا کلام شعر کی تقریباً ہر صنف میں موجود ہے۔ اگرچہ وہ اُردو کا اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہے مگر اوسط درجے کے شعرا میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ غزلوں کے علاوہ قصیدوں اور مثنویوں میں خوب زور دکھایا ہے۔ شہر آشوب ، واسوخت ، مخمس ، مثلث ، رباعیاں اور تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ ان نظموں سے کہیں کہیں ‘شفیق‘ کے ذاتی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ‘شفیق‘ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے فرزند میر احمد علی خاں عالی جاہ کے متوسلین میں سے تھے۔ یہ بڑے قدر دان اور ‘مہزور‘ رئیس تھے اور ‘شفیق‘ کو انہیں کی سرکار سے تعلق تھا۔ ان کی مدح میں اس نے کئی قصیدے لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک قصیدے میں صاف صاف نام اور پتہ بتا دیا ہے :—

یک زبودست ہے مرا والی
یک قوی دل مرا ہے پشت و پناہ
حق و باطل ہے سامنے جس کے
یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ
یعنے نواب میر احمد خاں
اسدالہلک حضرت عالی جاہ
باپ جس کا نظام دولت و دیں
جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

ایک دوسرے قصیدے میں لکھتے ہیں :

جناب پاک یعنے میر احمد خاں عالی جاہ
کہ جس کی عمرو دولت کا نگہاں ایزد سبحان

آگے چل کر سفر میں رہنے کی صعوبت اور اپنے ضعف کی شکایت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ملازمت ایسی تھی، جس میں دورہ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:—

مگر فضل خداوندی مری اب دستگیری کر
فشست شہر فرماوے عنایت کر کے ذیم ناں
آخر میں اپنے لڑکے کے لیے درخواست کی ہے:—

مدد خرچ اب مرا دستخط ہوے اس بندہ زادہ کو
تعیین ہو دیو تھی کا بلکہ کی جب تک کہ ہے ناداں
ایک اور قصیدے میں بھی اپنے آقا کا نام اور خطاب کا ذکر کیا ہے:—

چراغ دودۂ حیدر جناب میر احمد خاں
کہ جس کے جد کے تئیں چرخ بریں سے ذوالفقار آئی
وواسد الہلک اسدالہ اس کا ہافہ بل نت ہے
کہ جس کی دھاگے شیروں کو تب بے اختیار آئی
فظام الدولہ آصف جاہ کا فرزند ارشد ہے
کہ دولت جس کے در پہ جہہ سا امیدوار آئی

ایک صاحب سے ’شفیق‘ کو بے حد الفت ہے اور اکثر غزلوں میں افتہاے
معہبت سے ”میرا میاں میرا میاں“ کو کے اُسے یاد کیا ہے۔ بعض غزلیں کی غزلیں
اس کی یاد میں (”میرا میاں“ کی ردیف میں) لکھ دالی ہیں۔ ایک قصیدہ
بھی اسی ردیف میں لکھا ہے اور بڑے شوق اور معہبت سے اس کا ذکر کیا ہے۔
جس کے دوچار شعر یہ ہیں:—

ہے مرا ایمان و جاں میرا مہاں سبکو ہے ورد زباں میرا میاں
انتظاری کی نہیں طاقت مجھ جلد آ میرے میاں میرا مہاں
گلِ سلمے بلبل کو اور قہری کو سرو میرے تئیں میرا میاں میرا میاں

ایک غزل میں مجھے کی طرز میں نام بھی بتا گئے ہیں اور وہ نام ”شکرو میاں“ ہے۔

’ذکا‘ (سید امتیاز خاں) سے بھی اپنی عقیدت کا بار بار اظہار کیا ہے:-
 عقیدت ہے ’ذکا‘ سے میرے تیں از بسکہ اے ’صاحب‘
 مجھے ورد زباں ہے رات دن یا پیو یا ہادی
 ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

یک آن جدائی نہ ہو ’صاحب‘ سے ’ذکا‘ کو

اللہ کرے میری جو فیت ہے برآورے

’شفیق‘ کو ادبی تحقیق و نکات سے خاص ذوق تھا۔ توارڈ پر جو بحث اس نے کی ہے اور ایک غزل کے ضمن میں جو قطعہ توارڈ پر لکھا ہے وہ سب اس تذکرے میں موجود ہے۔ اردو کلیات میں ایک قصیدہ نظر پڑا جس کا مطالعہ یہ ہے:-
 ساقی اس ابر مشک فام کو دیکھہ اس طرف دیکھہ مے کے جام کو دیکھہ
 کچھ شعر لکھنے کے بعد گریز کی ہے اور الفاظ کے متحرک و ساکن ہونے کی بحث کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ایک ہم عصر ”مفتوں“ نے ان کے ایک لفظ پر اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب دیا ہے۔ ’شفیق‘ نے ختم (بسکون تا) کو ختم (بہ فتم تا) لکھ دیا تھا۔ معترض کی تردید اور اپنی تائید میں یہ اشعار لکھے ہیں:-

گر ختم کہوے ختم کو ”صاحب“ ہے روا حرکت مقام کو دیکھہ
 ریختہ کی زباں میں یہ غلطی ابتدا سے ہے انتظام کو دیکھہ
 ’آبرو‘ زلف کو زلف بولا اور الفاظ نا تمام کو دیکھہ
 نقل ہے وقت مغرب ’اعظم شاہ‘ یوں کہا اپنے یک غلام کو دیکھہ
 ہووے ”اسواری“ اس گھڑی تیار سیر چاہے جی پہ شام کو دیکھہ
 مولوی ’جیون‘ اوستاد شاہ تب کہے یوں تو اس پیام کو دیکھہ

لفظ 'اسواری' نہیں سواری ہے کچھ تو اس صحت کلام کو دیکھہ
 شاہ نے تب تو یہ جواب دیا: میری طرز سخن تمام کو دیکھہ
 یہ عبارت کہا میں ہندی میں اس میں جائز ہے تو نظام کو دیکھہ
 'شفیق' کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ عربی کے جو لفظ عام طور
 پر اردو میں بہ تبدیل حرکت وغیرہ بولے جاتے ہیں اور جو زبان زد خاص و عام
 ہو گئے ہیں وہ اسی طرح فصیح ہیں، خواہ وہ اصل لغت کے اعتبار سے غیر صحیح
 کیوں نہ ہوں۔ ہر زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ
 داخل ہوتے ہیں تو لہجے کے تغیر سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوجاتی ہے —
 علاوہ غزلوں اور قصیدوں کے 'شفیق' کا زور کلام دیکھنا ہو تو اُن کی
 مثنوی "تصویر جانان" دیکھنی چاہیے جو رسالہ 'تجلی' حیدرآباد دکن میں
 شائع ہو چکی ہے۔ اس میں بڑا زور سراپا کے بیان میں دکھایا ہے۔ اگرچہ
 یہ مضمون بہت پامال ہے اور ہمیشہ بھونڈا اور بے مزہ ہو کر رہ جاتا ہے
 اور یہی حال اس مثنوی کے سراپا کا بھی ہے، تاہم اس سے 'شفیق' کی قادر
 کلامی کا اندازہ ہوتا ہے —

اگر کوئی 'شفیق' کے نام اور حال سے واقف نہ ہو اور اس کا کلام پڑھے
 تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لکھنے والا ہندو ہے۔ وہ تمام بزرگان
 دین اسلام کا ذکر اُسی ادب، احترام اور عقیدت سے کرتا ہے، جیسے کوئی
 سچا اور پکا مسلمان۔ اور یہ کوئی تصنع سے نہیں بلکہ درحقیقت دل سے اور
 عقیدت سے ہے۔ معراج کے بیان میں جو مثنوی لکھی ہے اور جو "اردو"
 میں شائع ہو چکی ہے، اُسے دیکھئے، کوئی مسلمان اس سے بڑا کر کیا لکھے گا۔
 اردو کلیات میں ان کے متعدد قصیدے حضرت علی کی شان میں ہیں۔
 اسامِ آخر الزماں کی منقبت میں کئی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت
 غوثِ الاہظم جہلانی کی مدح میں ہے۔ ایک حضرت گیسو دراز بندہ نواز کی

تعریف میں - علاوہ ان قصائد کے اُن کے تھام کلام میں جہاں کہیں مسلمانوں کے بزرگوں اور اولیا کا ذکر آتا ہے تو وہ اُن کا نام اور ذکر اسی عقیدت اور ارادت سے کرتا ہے جیسے مسلمان - اس کے کلام میں اسلامی تلہیحات کثرت سے آتی ہیں ، بر خلاف اس کے ہندو دیوتاؤں وغیرہ کا ذکر شانہ ہی کہیں آیا ہو تو آیا ہو - یہ تعلیم ، صحبت ، ماحول اور اس زمانے کے اقتضا کا اثر تھا - آج کل کے لوگوں کو شاید یہ چیزیں پڑ کر حیرت ہو ، لیکن یہ اُس زمانے کی یادگاریں ہیں ، جب ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے سہتے تھے اور کسی کو کسی سے پر خاہی نہ تھی - یہ خوش حالی ، امن و آزادی اور ترقی کی شان تھی - جب افلاس کا منہوس قدم آیا تو جہالت ، تنگ دلی ، تعصب اور نا عاقبت افدیشی نے ایسا اندھا کر دیا کہ وہ اپنے پانوں پر خود کھڑی مارنے لگے - ایک دن آئے گا کہ وہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور گلے مل مل کر اپنے آفسووں سے اس داغ کو دھوئیں گے —

’شفیق‘ نے ”حسب حال زمانہ“ کے عنوان سے ایک شہر آشوب بھی لکھا ہے ،

جس کے ابتدائی چند شعریہ ہیں :—

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ ’صاحب‘ سن ادھر
کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ہے بتر
اس دکن کے بیچ چہ صوبوں کے چہ تھے بادشاہ
عادل اور فیاض ، صاحب ہزم اور صاحب ہنر
اُن کی دولت میں سرفہ اور سہی خواہ حال تھے
کیا رعیت ، کیا سپاہی ، کیا امیر فاسور
آسماں روہی ہے اور روہی زمیں ، خلقت ہے دو
پھر ہوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر

شامت نیت ہے یا تدبیر میں ہے کچھہ قصور

تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

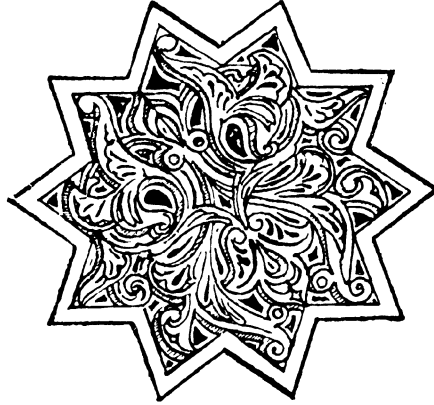
زمانے کی یہ شکایت ہر عہد میں رہی ہے اور رہیگی۔ آسمان نے ہزاروں

رفک بدلے، دنیا نے سینکڑوں پلٹے کھائے، مگر انسان کی شکایت کم نہ ہوئی۔

بے عیب نہ کوئی کتاب ہے، نہ کوئی آدمی، نہ کوئی نظام ہے اور نہ کوئی

زمانہ۔ یہ نقص کسی نہ کسی صورت میں رہتی دنیا تک رہے گا۔ بلاشبہ انسان کے

کہاں کی آزمائش اسی میں ہے —



ایک کھن

موزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل

موزا موصوف نے خواجہ میر درد کی مشہور غزل پر غزل لکھی تھی جو دیوان مطبوعہ میں نہیں۔ اب یہ غزل اردو میں اشاعت کے لئے پہنچتا ہوں جو ابھی ابھی منظر میں مولانا سید زاہد حسین صاحب زاہد سہارن پوری نے موصوفت فرمائی ہے۔ (صدر)

۱ ممکن نہیں کہ بیوں کے بھی از سید ہوں

میں دشت غم میں آہوے صیاد دیدہ ہوں

۲ ہوں درد ماند جبر ہو یا اختیار ہو

کہہ فائدہ کشیدہ کہہ اشک چکیدہ ہوں

۳ جاں آئی اب پہ تو بھی نہ شیریں ہوا دہن

از بسکہ تلخی غم ہجران چشیدہ ہوں

۴ نہ سبھ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ

میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں

- ۵ ہوں خاکسار پر نہیں مجھکو کسی سے لاگ
 نہ دائۂ فتادۂ ہوں نہ دام چیدۂ ہوں
 ۶ ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشان
 خارالم سے پشت * بدنِ داناں گزیدۂ ہوں
 ۷ ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
 میں عندلیب گلشنِ نا آفریدۂ ہوں
 ۸ ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
 ہوں میں کلامِ نغز و لے ناشنیدۂ ہوں
 ۹ جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت
 میں یوسف بقیعتِ اول خریدۂ ہوں
 ۱۰ اہل و رع کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل
 پر عاصیوں کے فرقے میں میں ہرگزیدۂ ہوں
 ۱۱ پانی سے سگ گزیدۂ ترے جس طرح 'اسہ'
 تارتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدۂ ہوں

• (ن) چوں شانہ پشت دسم —

† شعر ۶ و ۷ دیوانِ غالب مطبوعہٴ بدایوں کے نسخے میں بھی درج ہیں۔
 نسخہٴ حمیدیہ میں اسی ردیف اور قافیہ میں دو غلطیاں ہیں، لیکن ان میں بھی
 بحرِ این دو شعروں کے باقی شعر نہیں ہیں۔ (ادیٹر)

تقدیم اردو

حسن شوقی

از

(ادیٹر)

(۱)

حسن شوقی عادل شاہی شعرا میں سے ہے اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ تا سنہ ۱۰۶۷ھ) کے عہد میں تھا۔ اس کا پتا اس بات سے لگتا ہے کہ اس نے ایک نظم ”میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ“ لکھی ہے جس کا ذکر تھکے آئے گا۔ افسوس ہے کہ اس کا حال مجھے کسی تذکرے میں نہیں ملا۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور شعرا میں سے تھا۔ چنانچہ اپنی فشاطی نے اپنے قصہ پھولبن کے آخر میں جہاں چند مشہور اور نامور دکنی شعرا کا ذکر کیا ہے، وہاں حسن شوقی کا بھی نام لیا ہے —

حسن شوقی اگر ہوتا فی الحال ہزاراں بویجہ رحمت منج اہرال
پھولبن کا سنہ تصانیف ۱۰۶۶ھ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حسن شوقی کا انتقال ہو چکا تھا —

علاوہ غزلیات کے مجھے حسن شوقی کی دو نظمیں ملی ہیں۔ ایک

”قدنامہ نظام شاہ“ یا ”ظفر نامہ نظام شاہ“ اور دوسری ”میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ“۔ فتح نامے یا ظفر نامے کے میرے پاس دو نسخے ہیں جن میں سے ایک نسخہ ناقص ہے۔ ناقص نسخے کے آخر میں اشعار زائد ہیں۔ ان میں فتح کا سنہ بھی دیا ہے اور نظام شاہ کو بہت بہت دعائیں دی ہیں۔ جیسے کوئی زندہ شخص کو دعائیں دیتا ہے، مثلاً:

سہا جیو راجے جلم راجے کو بسے لگ دنیا نت فیا کاج کر
سہارک ظفر آسمانی اچھو تے فتح نصرت سبھانی اچھو

یہ فتح سنہ ۹۷۲ھ میں ہوئی اور ظاہر ہے کہ اس وقت شوقی زندہ نہیں تھا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ اشعار الحاقی ہیں۔ اسی نسخے کے آخر شعر میں شاعر کا تخلص بھی ہے۔ دوسرے نسخے میں یہ شعر نہیں ہے —

یہ جنگ جس کی فتح اس مثنوی میں منائی گئی ہے، تالی کوٹ کی مشہور لڑائی ہے۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں وجیا نگر کی حکومت نہایت شان و شوکت کی تھی۔ رام راج نے تمام باغی راجاؤں کو مغلوب کر لیا تھا اور اس کی سلطنت کرشنا سے لیکر راس کھاری تک پھیلی ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ گوداوری کے دھانے تک پہنچ گئی تھی۔ اور بہت سے راجا اس کے باج گزار تھے۔ اس وقت جنوب میں رام راج سے بڑا کر کوئی طاقتور اور زبردست راجا نہ تھا اور اس کی دولت اور شان کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بہمنی سلطنت کے زوال پر جو مسلمان حکومتیں اس کی جگہ قائم ہوئیں، ان کی باہمی نزاع سے وجیا نگر کی قوت اور بڑا گئی اور کرشنا اور تنگ بھدرا کا دوبارہ بھی ایک طرح سے وام راج ہی کے زیر اثر آ گیا۔ اس قوت اور عروج کے کھمبے پر رام راج نے طرح طرح کی دست درازیاں شروع کیں۔ تالی کوٹ کی جنگ سے چند سال قبل رام راج نے عادل شاہ سے مل کر نظام شاہ کو سخت شکست دی اور اس کے سارے ملک کو تباہ و برباد کر دیا۔ نظام شاہ مجبور ہو کر اپنے دارالحکومت احمد نگر میں

محصور ہو گیا۔ یہاں رام راج اور اس کے سرداروں نے بہت بد عنوانیاں کیں۔ مسیحیوں کو قتل کر دیے گئے، عورتوں کی آبروریزی کی اور اسی قسم کی شرمناک حرکتوں کے مرتکب ہوئے۔ مسلمان بادشاہ اس سے بہت برافروختہ ہوئے۔ لیکن اس سے بھی بڑا کر جو بات ان بادشاہوں کو ناگوار خاطر تھی وہ رام راج کا غرور و تکبر تھا۔ وہ پہلے کی طرح کہیں ان سے خلوت میں نہ ملتا اور جب کہیں دربار میں بلاتا تو سیدھے منہ بات نہ کرتا اور دیر تک کھڑا رکھتا۔ سواری کے وقت انہیں ساتھ ساتھ پیدل چلاتا، جب اجازت دیتا تو سوار ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ، نظام شاہ اور برید شاہ نے متحد ہو کر اس پر لشکر کشی کی۔ رام راج کو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر گھمبند تھا کہ اس نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان چھوکروں کو ایک ہی حملے میں پسپا کر دوں گا۔ اگرچہ بہت بدھا تھا مگر خود میدان کارزار میں پہنچا۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ مختصر یہ کہ رام راج اسی میدان میں مارا گیا اور وجیا نگر کی پر شان و شکوہ سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

’شوقی‘ نے اس جنگ کا حال شاعرانہ طرز پر لکھا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا نام ”فتح نامہ نظام شاہ“ کیوں رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو حسین نظام شاہ کو رام راج بہت ذلیل کر چکا تھا اور وہ انتقام کی فکر میں تھا۔ دوسرے نظام شاہ نے اس جنگ میں بڑی دلیری اور شجاعت دکھائی۔ قلب لشکر اسی کے زیر کمان تھا۔ جب ہندوؤں کی فوج نے یمنیں ویسار سے ایک شدید حملہ کیا تو مسلمان فوج کے پانچ اکھڑ گئے۔ اس سے علی عادل شاہ اور قطب شاہ پر مایوسی چھا گئی اور انہوں نے بھاگنے کی فکر کرنی شروع کی۔ مگر نظام شاہ قلب لشکر میں برابر جہا رہا اور اس زور سے فتنہ کے حملے کا جواب دیا کہ رام راج کے لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ شامت اصال سے یہ

دیکھ کر راجا تخت سے اتر کر پھر سنگھاسن میں سوار ہو گیا کہ اتنے میں نظام شاہ کا ایک مست ہاتھی غلام علی فاسی وہاں آ پہنچا اور آدمیوں کو پامال و ہلاک کرنے لگا۔ کپار (بھوئی) اس پریشانی میں سنگھاسن پتنگ کر بھاگ نکلے۔ اتنے میں کہ راجا سنبھلے سنبھلے مسلمان فوج کا ایک دستہ آ پہنچا اور وہ اسے پکڑ کر نظام شاہی توپ خانے کے افسر رومی خاں کے پاس لے گئے۔ رومی خاں نے نظام شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ نظام شاہ نے فوراً حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر کے فیزے کی نوک پر چڑھایا جائے اور مشہور کیا جائے تاکہ غنیمت کو حقیقت حال معلوم ہو جائے۔ اس لحاظ سے بھی فتح کا سہرا نظام شاہ ہی کے سر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ 'شوقی' نے اس فتح کو نظام شاہ سے منسوب کیا اور اپنی نظم کا نام "فتح نامہ نظام شاہ" رکھا۔

شروع میں چند شعر حمد میں ہیں:

الہی کرم کا کر نہار توں ہے اوّل و آخر رھلہار توں
سو قادر ہے قائم تو پروردگار توں قادر ہے دائم اپیں برقرار
کیا ہو کر تا کرے گا سو ہوئی توے باج ہرگز کرے ظ کوئی
دو چار اور شعر لکھنے کے بعد دو شعر نعت میں ہیں اور اس کے بعد آغاز جنگ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلا عنوان یہ ہے:

”شروع جنگ کردن رام راج و نظام شاہ و عادل شاہ و قطب شاہ و برید شاہ“

ابتدا میں شاعر بیان کرتا ہے کہ دنیا میں کیسے کیسے شجاعت اور دولت اور نام والے لوگ ہوئے ہیں، جن کی شہرت اور کارنامے اب تک یاد گار ہیں۔ اور اس ضمن میں سکندر، نوشیروان، جبشید، حمزہ، محمود غزنوی، رام چندر، کشن، ارجن، شہداد، ہامان وغیرہ کے نام گناتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ انسان کی خوبی اُس کے افعال سے ہے اور ہر ملک اور قوم میں اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ سدا ہے سو بھر پور دریا کوں جل شرت ہے سینپی کوں سو موتی بدل

شرت مرد کا ہے چلنت خوب خاص جو پھولوں کی خوبی سوں پھولوں کی باس
 ہر ایک ملک میں نیک رفتار ہے ہر ایک قوم میں نیک گفتار ہے
 اس کے بعد ہر ملک کی خاص خاص خوبیاں بیان کرتا ہے اور ملک
 دکن کو سب سے افضل ٹھہراتا ہے :

خراساں کے شاہاں ہیں شمشیر بند روہیلے پتھاناں و گرزى کمند
 عرب ہور عجم ملک لڑنے کو زور و ورايل جیتے راج ہیں دزد چور
 وو حکمت کرا ملک ہے روم و شام طرے کر بلا کے شہیداں تھام
 و و ایران و توران ہور ملک سند اہیں پڑ عقل بادشاہان ہند
 ہنر کا جیتا لوک ہے مغربی وو جامع اہیں گنجم کے مغربی
 وو قبطی فراست میں ہیں زور ور شمالی جیتے بے فہم گا و خر
 سو افضل میانا ہے ملک دکن ہوے یاں کے شاہاں جیتے خوش لکھن

اب دکن کے بادشاہوں کا ذکر کرتا ہے :

عادل شہ لکھاویں علی کے غلام نظام شاہ بھوی لکھاویں نظام
 عدل آباد ہور دے دھش کو اگل * کیا بادشاہی سو بازو کے بل
 قطب شہ کے گھر میں سدا راجوت + بریدی تھے جزوی جیو کے گھٹ +
 اس کے بعد آپس میں عہد و پیمان کرنے اور متحد ہو کر رام راج سے

لڑنے کا ذکر کرتا ہے :

اپس میں اپیں دوست سب مل ہوے محبت سوں اخلاص یک دل ہوے
 فزاع دل میں کا دور کیتے نفاق اپس میں اپیں مل کئے اتفاق
 یو سب مل کے ایسا کئے یک پنا جو اس کفر کو مار کرنا فنا
 کئے بھاگ سو گند و ہمد استوار یو غازی غزا پر ہوے برقرار

نکو تر بلانی جو شب درمیاں * دیکھیں کیا چرخ پھیر ہے آسمان
اس کے بعد دوسرا عنوان یہ ہے :

”راے‘ ذہیشمدن راسراج ہا وزیران خود برائے جگ کردن بہ نظام شاہ“

اس کی ابتدا شاعر نے سورج کے قوبنے، رات کے آنے اور چاند کے نکلنے سے کی ہے اور اپنی شاعری کا کمال دکھایا ہے۔ یہ نظامی وغیرہ فارسی شعرا کی تقلید کی ہے لیکن ہندی الفاظ اور ہندی خیال کی آمیزش نے اسے کچھ کا کچھ بدلا دیا ہے۔ یہاں چند شعر نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں :

و و محبوب نس† کی سنواری اپس	مر صبح زو رینا نکارو‡ اپس
سو کوئم و کیسر چوا ہور چندن	لیتے شک کے اونٹ چندر بدن
کھولے بل سر کے سو کالے دراز	سنواری بیٹھ لیکہ اپنا سو ساڑ
وہ موتی نگن کے سو تارے ہوئے	و و بیس § پھول سارے ستارے ہوئے

اس منظر کے بیان میں کوئی چوبیس شعر لکھے ہیں، آخری شعر یہ ہیں :

قوبی قاب زریں سو غرقاب میں	کئی حور زنگی کرے § خواب میں
حبش نے پھوان چیر سر پر ایسا	ترک دیکھہ پر نار سر تل کیا
حبش تی جو پرت ہوا چند روپ	حبش نے جنے ترک چینی سروپ
بیٹھا کاک کالا اوریا راج ہنس	اوٹھی سیام سندرسو ناراج اونس
پڑیا پھول پر جب بھنور پنکھہ پसार	چپیا ترک زنگی کھڑا آشکار
بیٹھا ¶ دھن اوپر آؤ کر کال جو	ہوا سورتل چاند اوہرال جو

* ”مدرس از بلایے کہ شب درمیان است“ کا ترجمہ ہے -

† رات ‡ نکھاری § سر § کے

¶ مطلب یہ کہ خزانے پر کالا سانپ آبیٹھا، یعنی اندھیرا ہو گیا۔ سورج

غروب ہو گیا اور چاند طلوع ہوا -

اس سہمے میں رام راج تخت پر آکر بیٹھتا ہے اور دربار کرتا ہے
 بیٹھا ، رام قب آسیاسن* اوپر مکت+ مال گل ‡ گول § ابرہن؟ اوپر
 سو دندوت کئے آؤ کر راءے سب جتے راءے رایل پڑے پاءے سب
 اب وہ خلوت میں خاص خاص صاحبوں اور ارکان سلطنت کو بلا کر
 مشورہ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ، نظام شاہ نے میرے دل میں کھاؤ ڈال دیے
 ہیں ، تھام دنیا سیری حکومت کو مافتی اور مجھے خراج دیتی ہے۔ بڑے بڑے راجہ
 مجھے تھفے بھیجتے ہیں ، لیکن یہ ترک مجھے خاطر میں نہیں لاتا ، نہ یہ دیو کو
 مافتا ہے نہ پری کو خراج دینا تو درکنار اور قراتا اور دھمکتا ہے۔ آج چار دانگ عالم
 میں میرے نام کا دنکا بچ رہا ہے۔ اس کی کیا یہ حقیقت ہے۔ اب تم مجھے
 سوچ کر مشورہ دو کہ اس معاملے میں کیا کروں۔

کیا رام خلوت منے انجھوں بلایا جتے راءے اور راءے زن
 چندر بھان یلتم وینکٹا دھری آ ‡ جلن بھارسوں دھرتری تھرتوری
 رتن جوت چوکھی دھریا سامنے کہا بیس ۛ مجھے آمنے سامنے
 کہنیا رخت ہوات کے تم تھانف ۛ ہیں تمہیں مرد میدان کے رن تھانف ۛ ہیں
 تمہیں پانچ تن ملکہ ۛ یک بد کہو تمہیں پانچ جن ملکہ یک سد کہو
 بہوت دن تی چھاتی منے سل ۛ اھے نظامیا سوں مجھے آج سو فدل ۛ اھے
 اس کے بعد کا عنوان یہ ہے :

” راءے دان وزیراں رام راج را درباب جنگ نظام شاہ “

سب وزیر اور مشیر یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ آج دنیا میں تیرا وہ

* سلگاسن ، تخت + تاج ‡ گلے کا ہار § ڈالکر

؟ جواہرات ، لباس فاخرہ آ رام راج کے بھائی کا نام تھا

ۛ بیٹھے ۔ ۛ ترم ستون کہم ستون پہلے جنگ کے ستون ۔

ۛ ملکہ ۛ کرپ ، پے چھنی ، نکلیف ۛ جنگ

زور ہے کہ کسی راجہ یا بادشاہ کی مجال نہیں کہ تیرے سامنے آنکھ اٹھا سکے۔
تو وہ شاہ زور ہے کہ شیر اور سیمرغ تیرے آگے کہوترے بچے ہیں۔ نظام
شاہ بھارے کی کیا حقیقت ہے —

کہاں رام راجا کہاں شاہ حسین

کہاں بحر قلزم کہاں قلندین

توں گرمی منے شاہ تی کم نہیں توں سردی منے ماہ تی کم نہیں
افدھارے اجالے کوں توں دھوپ چھانوں خرابی کو تو فکریہ و بستی کو گانوں
وو گرمی کرے توں تو سردی سوں ڈال وو سردی کرے توں تو گرمی سوں جال
یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ راے دی کہ حسین نظام شاہ کو لکھا جائے کہ وہ
نقد و جواہر، اسلحہ، عود و عنبر اور ملک میدان (توپ) وغیرہ وغیرہ بطور خراج کے
بھیجے۔ اس مشورے کے مطابق اب خط لکھنے اور بھیجنے کی تیاری ہوتی ہے —

”نامہ نوشتن رام راج بہ نظام شاہ و طلب کردن بعضے اشیای عجائب“

نامے کے شروع میں خدا کی حمد و ثنا ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ کفر و اسلام میں کوئی
فرق نہیں، سب میں اس کا جلوہ ہے اور انسان انسان سب ایک ہیں

توں شہاد ہور عاد نہرود کوں جدا کر نہ بوجے توں معبود سوں
اگر فیل و مور اژدر و بق اھے ہر یک شے منے مظہر حق اھے
توں کرتا ہے افکار کفار سوں نہ کفار سوں بلکہ کرتار سوں
اھے کفر و اسلام کرتار کا جو جینے میں تھا گا سو زفار کا
ولے جو ہوا سو موحد ہوا موحد ہوا میں سو ملحد ہوا
کہے شیخ سعدی نے عالم کو بند بنی آدم اعضاء یک دیگر نہ
پھر ہدایت کی ہے کہ تو گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دے۔ مکے کی جگہ

ترمیل کو سمجھ اور عرب کی بجائے جنگموں کی پوستش کر - یلورا اور درات آباد کی حفاظت کر

قوی کر یلورے کی بنیاد کون جو خجالت اچھے قصر شہاد کون
 نہ کم مان دے دولت آباد کون نہ سر پار کر دیکھ شہشاہ کون
 غرض اس قسم کی نصیحتیں کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ میرے خراج کو
 خدا کی ذکات سمجھ اور یہ یہ چیزیں فوراً بھیج دے۔ اس میں گھنے، زیور،
 جواہرات، ہتھیار، طوائف، رفتیاں، تومنیاں، سلطان فیروز کی زبرد کی صراحی
 اور یاقوت کا پیالا، دنیا بھر کی چیزیں آجاتی ہیں۔ اس کے بعد لکھتا ہے کہ
 یہ خراج تو نے مجھے بھیج دیا تو اس کے صلے میں میں تجھے احمد نگر بخشوں گا۔
 خط کے آخر میں فخر یہ اشعار ہیں۔ جن میں یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر تعمیل
 نہ کی تو نظام شاہی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا

نہ ترکاں کون چھوڑوں نہ ترکی کھان اگر گیارہ رستم ہو حاضر ضہان
 نہ چھوڑوں سلافا نہ چھوڑوں فقیر نہ بڑ کا نہ لڑکا نہ ہونا نہ پیر
 اوک دور بنیاد اسلام کی جو مالے درا ہی • جگت رام کی
 یہ خط لے کر ہوی داس ایلچی نظام شاہ کے ہاں پہنچا۔ بادشاہ خط پڑھ کر

مسکرایا اور مشورت کے لئے وزیروں کو طلب کیا

”طلب کردن نظام شاہ وزیران خود را و بایشان مشورت کردن“

شروع میں چند اشعار سورج کے توبنے اور چاند کے فنکٹنے پر ہیں۔
 شب میں بادشاہ کا دربار ہوتا ہے اور اس دربار کا تہات بیان کیا ہے۔
 جب سب امیر وزیر جمع ہو گئے تو نام لے لے کے سب کو مخاطب کیا اور
 رام راج کا خط سنایا اور نہایت جوش اور غصے سے اس کے تہرہ اور جہرو تعدی

اسلام کی بے حرمتی اور مسجدوں کے انہدام کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے اس وقت تک چین فہیں آئے گا جب تک اس مردود کا سر قلم نہ کر دوں

نہ مجھے آس دہن دین کی ریس ہے

مرا کھرک * اور رام کا سیس + ہے

”جواب دادن و وزیران نظام شاہ را درباب فکر رام راج“

وزیروں نے جواب دیا: —

نکر فکر کچھ رام کے کام کی نہ اس رام کی بل ہریرام کی

تجھے فوج د سکندر ا ہے اقا سو جہریل کا پورا ہے

تجھے چرخ بازو کھرک برق ہے اُسے سنگ خارا اگر فرق ہے

غرض اسی طرح نظام شام کی تعریف اور رام راج کی مذمت ہے۔

”نامہ نوشتن نظام شاہہ رام راج در جواب او“

دبیر شاہی کو جواب لکھنے کا ارشاد ہوا اور اس نے حمد و ثناء سے فائدہ نامہ

شروع کیا۔ پھر بہت سے مقدس بزرگوں، مقرر کتابوں اور چیزوں کی قسمیں

کہا کر رام راج کو ہدایت کی ہے:

نہ پتیاو † کچھ زور کے تین نگہ راکھ وزن ترازو کے تیں

نکر کچھ بھروسا کہ آپار § ماں کھنا ماں جس تس کھنا گو شہاں

بتی جال فا جال فانوس کوں نگہ راکھ توں اپنے فانوس کوں

یعنی اپنے زور بازو پر گھمٹ نہ کرو اور ترازو کے وزن کا دھیان رکھو۔

اپنی بے شمار مال و دولت پر بھروسا نہ کرو، کیونکہ جس کے پاس دولت زیادہ ہے،

اُسے مصیبتیں بھی زیادہ بھگتنی پڑتی ہیں۔ بتی جلاتے جلاتے فانوس نہ

جلا دینا اور اپنی عزت آبرو کا خیال رکھو - آخر میں دھمکی دی ہے :

سو مشعل جلاؤں سر اندیپ پر اوجالا کروں سب سنگل دیپ پر

دسا سیر کا سیر * چابوں کچا کہ سیمرغ مجھہ کن † کھوتر بچا

قاصد یہ خط لیکر رام راج کی طرٹ روانہ ہوا

”قاصد فرستادن رام راج بار دیگر بعد از شہنشاہ فامہ نظام شاہ“

رام راج نے جل کر جواب دیا اور اپنے خط میں خوب خوب چرکے دیے ہیں،

آخر میں کہتا ہے کہ اگرچہ تو شاہ بن شاہ بن شاہ ہے اور گو عہاد

(عہاد اہاک) تیرا پیشوا ہے اور اگرچہ تو نے خاندیس پر اپنی دھاک بٹھائی

اور گوند والے سے خراج لیا، بہادر (بہادر شاہ) کو تو نے زیر کیا اور ہمایوں سے بڑی

بہادری سے اڑا اور فرنگیوں کو بڑگایا اور ملک کو اس شجاعت سے فتح کیا کہ

سلطان روم نے بھی آفریں کی مگر رام (راج) کچھ اور ہی چیز ہے —

سبھی جگ ملے رام ان میل ہے بلے موم آتش کنے تیل ہے

اگر شاہ کا وُس یا کیقباد تو میں رام فرعون و شداد و عاد

... ..

اگر نور وادی ایمن ہے شاہ و گر سور نوروز بہمن ہے شاہ

کم اندیش ہے چارده سال کا پر وبال دھرتا ولے بالکا

سومیں رام دجال کوں اصل ہوں سو شداد بن عاد کی نسل ہوں

نہ میں رام بل رام لکھن ہوں میں جویک من ہے بھیروی † تراکھ من ہوں میں

یہی بول قاصد روانہ کیا وو آشہ فزیک § ماجراسب کھیا

”سوار شدن نظام شاہ ہرآے جنگ رام راج“

اس میں فوج کی تیاری اور روانگی کا سہاں دکھایا ہے - غرض نظام شاہ اپنی

فوج لے کر کوچ پر کوچ کرتا ہوا میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتا ہے

ہوا گرم تر مغز تب راعے کا

سنا جب یو آواز کرناے کا

(مستعد شدہ آمدن رام راج برائے جنگ نظام شاہ)

رام راج نے نظام شاہ کے کوچ کی خبر سنی تو اس نے بھی اپنی فوج کی تیاری

کا حکم دیا اور فرمایا :

کہ میں رام اچھتے * ترک زور کیا

سمندر اچھے حوض کون شور کیا

مختلف فوجوں کی تیاری اور روانگی کا حال کسی قدر تفصیل اور شان سے

بیان کیا ہے - آخری شعر یہ ہے :

خبر گرم تر ہو (ن) بھر گوہ میں (ن) ہوئی ہر

کہ دریائے (ن) لٹکھا ہوا جوہ میں (ن) طوفان آتش

(فتح یافتن نظام شاہ بر لشکر رام راج و سرا ورا بریدہ)

پیش تغال خاں فرستادن)

لڑائی بڑے زور شور سے ہوتی ہے لیکن شاہر شروع ہی سے حسین شاہ کا

غالبہ بتاتا ہے - چنانچہ ابتدا ہی میں یہ شعر ہیں :

کاپ + جو کانگاں کے وو دیکھ عین چلیا فوج رخ باند بھیڑی حسین

چلیا دل کھندل جوں گرج کھن جیتا دندی بھول اوساں گئے لت پتا †

غرض یہ کہ

* ملصوبہ —

• ہوتے ہوئے —

† فوجوں کو ہمدلوں کی گرج کی طرح دوندتا ہوا چلا اور دشمن کے

اوسان خطا اور پریشان ہو گئے —

خلل تھا کفر کا دیا جس خدا کیا رام کا سیس تن سے جدا
 وحیا نگر شہر کو ڈا کیا ، بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا اور بادشاہ نے فہاز
 پڑھی اور خدا کی درگاہ میں شکر ادا کیا —

اس نظم کا جو ناقص نسخہ میرے پاس ہے اس میں فتح اور غنیمت کا دل
 ذرا بڑھا چڑھا کر لکھا ہے اور نظام شاہ بحری کی خوب دل کھول کے تعریف کی ہے
 اور آخر میں بہت سی دعائیں ایسی دی ہیں جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاعر
 اس وقت زندہ تھا۔ فتح کا سنہ اور اپنا تخلص بھی دیا ہے۔ نیز شہر وحیا نگر
 کی رونق اور دولت اور اس کی شان و شوکت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ چیزیں
 مکمل نسخے میں نہیں ہیں —

اگرچہ واقعہ شاعرانہ پیرایے میں لکھا گیا ہے، تاہم اس سے بعض تاریخی
 باتوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً نظام شاہ اور رام راج میں جو خط و کتابت ہوئی ہے ،
 اگرچہ یہ فرضی ہے ، لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے خیالات ایک
 دوسرے کے متعلق کیا تھے اور وہ ان کی کن کن چیزوں کو ناپسند کرتے تھے۔
 اسی طرح بعض ناموں کی تصدیق اور تصحیح ہو جاتی ہے۔ چناںچہ اس لڑائی
 میں جو بعض سردار شریک تھے ان کے نام آگئے ہیں۔ غرض یہ مثنوی علاوہ
 شاعرانہ حیثیت کے تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس لئے میرا ارادہ ہے کہ
 فرہنگ کے ساتھ پوری مثنوی شائع کردوں۔ اس میں بہت سے غیر مانوس اور
 اجنبی لفظ آئے ہیں، جن کا سراغ لگانا اس لئے اور دشوار ہو گیا ہے کہ اصل سے بگڑ کر
 کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں —

(۲)

” میزبانی نامۃ سلطان محمد دادل شاہ “

پہلی مثنوی جس کا اوپر ذکر ہوا ہے ” فتح نامۃ نظام شاہ “ ہے ۔

اس میں جو نظام شاہ کی تعریف اور شان و شوکت دکھائی ہے اس سے معلوم ہو تا ہے کہ 'شوقی' کا تعلق نظام شاہیوں سے ضرور رہا ہے۔ اگرچہ مثنوی کی ابتدا میں عادل شاہ، قطب شاہ اور برید شاہ کا نام لیا ہے، لیکن دوران جنگ اور اٹنائے فتنہ میں کسی کا کہیں ذکر نہیں۔ یعنی جو کچھ کیا نظام شاہ نے اور فتح کا سہرا بھی اسی کے سر رہا۔ گو تاریخی لحاظ سے بھی یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس سے 'شوقی' کی طرفداری صاف ظاہر ہے۔ اس سے بھی ثابت ہو تا ہے کہ وہ پہلے نظام شاہی دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ یا تو نظام شاہی حکومت کی تباہی پر یا کسی اور وجہ سے اس کا تعلق وہاں سے قطع ہو گیا اور وہ عادل شاہی دربار میں آ گیا۔ نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ سلطان محمد عادل شاہ ہی کے زمانے میں ہوا بلکہ ایک حد تک اس کا انزام عادل شاہی حکومت پر ہے کہ اس نے مغلوں سے ساز باز کر کے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا اور سلطنت کے حصے بخرے کر لئے۔ اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ اس تباہی کے بعد 'شوقی' دربار عادل شاہی میں آ گیا ہو۔

اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کا حال ہے۔ اگرچہ کسی تاریخ میں مذکور نہیں لیکن اس مثنوی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی ایک شادی مصطفیٰ خان کی لڑکی سے بھی ہوئی تھی۔ مصطفیٰ خان محمد عادل شاہ کا وزیر اعظم اور سلطنت کے بڑے امرا میں سے تھا اور اُس نے بڑے بڑے کارنامے کئے تھے بلکہ ایک مدت تک سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک رہا۔ اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کی میزبانی، سلطان کی شہر گشت، مصطفیٰ خان کی مہمانی اور ہیبتی کے جھیز کا ذکر ہے۔ یہ چند باتیں بھی زیادہ تر مثنوی کے مختلف عنوانات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مثنوی میں جشنوں کی دھوم دھام، میزبانی اور مہمانی کی شان و شوکت، عیش و عشرت کے سامان کا تو بہت کچھ ذکر ہے مگر اصل واقعات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

مثنوی کا آغاز حمد سے اور اس کے بعد بادشاہ کی تعریف سے ہوتا ہے۔ حمد میں بھی صرف ایک مصرع ہے اور اس کے بعد ہی بادشاہ کی مدح شروع ہو جاتی ہے۔ ابتدا کے شعر یہ ہیں :

اول یاد کر پاک پرور دگار	پچھیں شاد کر شاہ عالی تبار
نبی کا خلیفہ خدا کا خلیل	بالہام و ہاتف فہ با جبرئیل
دم اندر جو عیسیٰ مریم تہام	تکلم میں موسیٰ علیہ السلام
شجاعت سہن رستم تی پچھہ کم نہہن	سقاوت میں ایسا جو حاتم نہیں
سر سرفرازان بندے نواز	سو کردن فرازاں میں کردن فراز
سو سلطان محمد عدالت پناہ	کہیں خلق جس مکرمت دستاہ
خداوند تعالیٰ کی وہ چھانوں ہے	عرب ہور عجم میں جسے فانوں ہے
کرے عیش و عشرت جواناں سنگات	ولے مشورت پیر دانان سنگات
بڑا گیان وقتا رتن پا رکھے	رتن پا رکھے ہور بچن پا رکھے
سومیتھی شہر یار کی بات ہے	سو اس بات کی دہات فابات ہے
اگر شہ سناوے مجھے بول کر	تو فابات کوں میں ستوں * بول کر
چو من کیست بارے دریں بوستان	کہیں جس کی طوطی بہندوستان

اس کے بعد وہ شادی کا ذکر چھیڑتا ہے :

سنیا میں کہ شہ گھر بڑا کاج ہے	کہ جس کاج کا خلق محتاج ہے
جہاں دار نے میزبانی کریا	اے فانوں میں شادمانی کریا

اس کے آگے میزبانی کے ساز و سامان، مکانات کی آرائش اور انتظامات کی کیفیت تفصیل سے لکھی ہے۔ شروع اس طرح ہے کیا ہے :—

صفادار صوفے و مذاوے بلند چھجے شہ نشین پادشاہاں پسند

بشنکرت سرخ و بزر نیخ زرہ بز وحل و زرنسگار * و بالا جورہ

صفادار صوفے رنگا رنگ ہوے نمودار جاے کہ از رنگ ہوے

تکتال سوں کاخ ساتیاں مزی سوزربات سوں باغ ماتیایں مزی

اسی طرح ہر چیز اور سامان کا ذکر کرتا چلا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ”صوفے“ کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ انگریزی میں یہ عربی لفظ ”صفہ“ سے پہنچا ہے۔ فارسی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔

دوسرا عنوان یہ ہے:

(مجلس آراستن و بخشش کردن سلطان معہک مردماں را در میز بانہی خود)

بادشاہ تخت پر جلوہ فرما ہوتے ہیں اور امرا، وزراء سبجا و آداب عرض کرتے ہیں:

ہیتھا تخت پر آو جہشید سا زر افشاں کیا دست خورشید سا

سلحدار سردار جیتے وزیو نہ گھر میں رہیا کوئی بر نناؤ پیو

جیتے سرفرازاں جو درگاہ کے جیتے معرماں خاص خرگاہ کے

سوسربھویں دھرے شاہ عالم کے تیں رہے دیکھ کر ماہ عالم کے تیں

کتے سیس کے پائے لشکر کشاں سوکر جوڑ ٹھارے رہے سرکشاں

اس کے بعد بادشاہ انہیں بیش بہا خلعت اور انعام و اکرام عطا فرماتے ہیں۔

شاعر ہی انعام و اکرام کی تفصیل بیان کرتا ہے، جس میں نفیس نفیس کپڑے،

ہاتھی، گھوڑے، جواہرات، عطریات سب کا ذکر آجاتا ہے۔ پانوں کا ذکر خصوصیت

سے کیا ہے۔ شوقی رام راج کی شان و شوکت نہیں بھولا، چنانچہ کہتا ہے:

یتا خرچ پاناں ہوا راج کاج نہ سونے میں دیکھا کبھی رام راج

مختلف قسم اور مختلف مقامات کے پانوں کے نام لیتا ہے اور طرح طرح

کی تشبیہیں دے کر بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

اور خاتمے پر کہتا ہے:

• (ن) یہ لفظ غالباً ”زنگار“ ہوگا۔ زنگار سے مصرع غلط ہو جاتا ہے۔

کیتا کوئی کھائے کیتا کوئی لے جائے مچھر کوہتے • ہور مکھی کو شکائے †
 کئے شکر یکبار عالم تمام محمد نبی پر درود و سلام
 قہسرا عدوان یہ ہے :

(در بیان شہر گشت سوار شدن سلطان محمد عادل شاہ)

شہر گشت کا بیان بہت خوبی سے لکھا ہے شروع یوں ہوتا ہے :

• سدا دار پر تجھ منگل † گر کریں منگل گر کریں جیوں بدل ‡ گر کریں
 ہتی مست پر پیلباں مست ہے زبردست پر کیا زبردست ہے
 سدا دار پر تجھ طبل باجتمہ طبل باجتمہ ہور مند ‡ کا جتمہ
 بہت دیس تی شہ کے گھر کام ہے شہر گشت کی رات سو آج ہے
 شہر گشت کا ساز و سامان ہوا نفیریاں تراتے دسامان ہوا

اس کے بعد جلوس کا حال اور اس کی شان و شوکت ہے۔ بادشاہ کو سواری،

طرح طرح کے باجے گاجے، ناچ رنک، آتش بازی، روشنی غرض ہر چیز کو بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔ چند شعر ناچ کے متعلق دیکھئے، فاجنے والیوں کے انداز کس خوبی سے ادا کئے ہیں :

ہر کنیاں و کنچنیاں بھوت ساز سوں بجاویں و گاویں بھوت ناز سوں
 خوشی خرمی میں اوبلتیاں چاہیاں اکھرتیاں و پھرتیاں اوچھلتیاں چلیاں
 سپیلیاں سپیلیاں میں جیلتیاں و تیاں لٹکتیاں ٹھکتیاں و تالتیاں و تیاں
 آتش بازی کے بیان میں ایک شعر ہے :

ہوایاں فتمہیاں و اتمہیاں ناکنیاں ہوا کے اوپر جا سنپولے جنیاں
 ہوائیوں کو ناگنوں سے بہت اچھی تشبیہ دی ہے۔ یعنی وہ ہوائیاں نہ
 تھیں بلکہ ناگنیں تھیں اور اوپر ہوا میں جاکر جو چھتیں اور ان سے پھول

گرے تو وہ پھول نہ تھے بلکہ سپولے تھے جو اُنہوں جنے —
تیسرا عنوان یہ ہے :

(در بیان مہمانی کردن نواب مصطفیٰ خان سلطان محمد عادل شاہرا و دادان جہیز دختر)
صبح ہوتی ہے :

بیٹھا سور جب نور کا تاج کر بیٹھی رات کوہ قات میں لاج کر
مصطفیٰ خان کی مہمانی :

سلیمان کو آصف نے مہماں کیا عجائب غرائب بہوت کچھہ دیا
سلطان کو اپنی بیٹی دیتا ہے یعنی چاند کو سورج کے حوالے کرتا ہے :

دیا چاند کوں سور کے سات کر دیا نور کوں نور کے سات کر
اس کے بعد جہیز کا ذکر ہے ۔ پھر مجلس کے فاج رنگ کا ذکر دل کھول کے کیا
ہے اور شاعری کی داد دی ہے ۔ گانے اور فلچنے والیوں کا سراپا، ان کے ناز و انداز
اور فاج کا سماں خوب لکھا ہے ۔ آئنے میں سلطان محمد عادل شاہ کے سامنے
دسترخوان بچھتا ہے جس پر طرح طرح کے نفیس کھانے سونے چاندی کے باسنوں میں
چنے جاتے ہیں ان کی تفصیل بھی پڑھنے کے قابل ہے، جس سے اس وقت کے کھانوں کی
کیفیت معلوم ہوتی ہے ۔ آخر میں دعا پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے ۔

دعائید شاعر یہ ہیں :

قلم (گر) کروں راس سب بانس کے	سیاہی دریا، کاغذ آکاس کے
کھٹے ہو رکھے بھرے یو تمام	صف شہ کی پوری فہرے والاسلام
تو بہتر کہ 'شوقی' زراہ صواب	دعا وو کرے جو اچھے مستجاب
سدا جیو راجے جنم راج کر	جو دشمن موافقی تل کرے لاج کر
کرے راج جو لگ لگن دھرتی	کرے راج جو لگ پرب استری
شہر یار خاطر کے تہیں شاہ دار	قیامت لگوں یو رھوے یاد گار

(عزلیں)

مجھے شوقی کی کچھ غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن سے اس کی شاعری اور جوہر کھلتے ہیں - ایک غزل اس نے مسلسل لکھی ہے جس میں شروع سے آخر تک ”نین“ اور ”سوکا“ کی تعریف ہے اور ان کو اس نے فنی فنی اور طرح طرح کی تشبیہوں سے مرصع کیا ہے۔ ”سوکا“ سرمے کا وہ خط ہے جو عورتیں آنکھ سے لیکر زلف تک کھینچتی ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا سنگار سمجھا جاتا تھا۔ اس غزل کے چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں:

دلبر سلونے نین پر کھینچی ہے سو کا خوبتر
خطاط جیوں ماریا رقم چھندوں ٹاٹ کے صاد پر
یا چک دوات ہے سیم کی کیکی سو بھر سیاہی رکھ
سوکا قلم جیوں راستی کا تب گیا اُس میں بسر
یا نین موتی تھال ہیں سو کا سوتا کا نیل کا
موتی پرو کر کھینچتے تو راہیا ہے توت کر
تجھ زلف ہے جیوں ناگنی سو کا بچا نیکا * جنی
مت کھالے کیں وہ پابندی اسنیں چھپا نوکس بہتر
یا نین بازیگر اہیں تجھ حسن کے بازار میں
سوکا سلائی سحر کی بھایا * اُس اپنے آنکھ بہتر
یا ترنگ اچھل نین ہو سار سو ہندو برن
سوکا لے ہرچھا نین دھر آیا کسی جیو مار کر
آہو کو بیتھیا تیریا مکھ میں کنجن چار یا لیا
یا تل زنگی کوں مارنے لوچن ترک کنچیا † خنجر

یا پھول ہے گل لالہ کی سو کا تفتی اس پھول کو
پتلیاں مرتب یوں دیسے جیوں پھول پر بیٹے بھنور
ایک پوری غزل میں تجنیس لفظی سے کام لیا ہے۔ ہماری شاعری میں
اس قسم کی صنائع کا شوق ہر زمانے میں رہا ہے۔ چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

گُھب گُھب رہی ہے من میں ترو زلف کی کُھب کُھب؟
مچ جیو کے کُھلے میں پڑیا ہے طوق غب غب
تپ تپ ہوا ہوں تب سین تیرے وصال کا رن
چپ چپ کیا ہوں چپنا ہر دم کتاہوں! اب اب
تج وصل کوں درنگ ہے ہو مچ نہیں صہوری
جاتی ہے زندگانی آتی ہے موت دب دب!
سروے قداں سوں ہارے • شوقی ہوا ہے • مجنوں
کب کب کیا ہوں توبہ کب کب کیا ہوں کب کب

ایک اور غزل کا مطلع اور مقطع لکھ کر مضمون ختم کرتا ہوں
تجہہ نین کا ماتا ہے جو اُس جام سیتی کام کیا
تجہہ زلف کا کافر اوسے اسلام سیتی کام کیا
شوقی نہ دکلا طمع کچ فردوس کی
سنا • جو کرتا ہے اُسے انعام ستی کام کیا



تبصر

۵۸۳	فلسفہ رفیع و راحت	ادب
۵۸۳	معیار الاخلاق - عربی	ساندھو اور بیسوا
۵۸۳	گالے بیل	۵۶۲
۵۸۳	ظریف معلم جلد اول و دوم	۵۶۳
	قاہلیخ	۵۶۳
۵۸۳	مزارات حرمین	۵۶۴
۵۸۵	حیات جلیل	۵۶۵
	اردو کے جدید رسالے	۵۶۶
۵۸۶	ادبی دنیا	۵۶۷
۵۸۹	پیام تعلیم	۵۶۷
۵۸۹	مبصر	۵۶۷
۵۸۹	انکشات	۵۶۹
۵۸۹	خضر راہ	۵۸۱
۵۹۰	کامیابی	۵۸۱
۵۹۱	امداد باہمی	منی لہب
۵۹۱	ایجو کیشنل گزٹ	۵۸۲
۵۹۲	رسالہ کمیکل سوسائٹی	تعلیم
۵۹۲	مسیحائے زمان	بچوں کا دستور العمل (یا) سیرت و کردار ۵۸۲

ادب

سادھو اور بیسوا

(مصلفہ جناب کشن پرشاد کول صاحب، انڈین پریس الہ آباد، صفحات ۲۰۳، قیمت بارہ آنے)

جناب کشن پرشاد کول صاحب ملک کے سچے خادموں میں سے ہیں۔ ان کا مقصد ملک کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ اسی موضوع پر فسانے کے پیرائے میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ کول صاحب کو لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے اور صاف ستھری زبان میں اپنے خیالات بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ یہ فسانہ بہت دلچسپ اور عبرت خیز ہے۔ اس افسانے میں اصل اشخاص دو ہیں۔ ایک سادھو دوسری ایک بیسوا۔ زمانے کے حالات نے ان کی زندگی میں ایسی کایا پلت کی ہے جسے پوہ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور عبرت بھی۔ سادھو بیسوا کو ناپاک زندگی سے نجات دینے چلے تھے۔ خود اس کے شکار ہو گئے اور بیسوا ان کی تلقین سے متاثر ہو کر اُس درجے کو پہنچ گئی جو سادھو کو باوجود ریاضت کے کبھی فصیب نہوا تھا۔

قصے کے ضمن میں ہندوستانی معاشرت کا چربہ بھی خوب اتارا ہے جو کول صاحب

کا اصل مقصد ہے —

جیسا کہ لائق مصنف نے خود ہی لکھ دیا ہے اس کتاب کا خیال انہیں ایک فونکی ناول سے پیدا ہوا، یہ فرانس کے مشہور اور عجیب و غریب ادیب اور ناول نویس اناتول فرانس کا ناول تھاؤیس ہے۔ اگرچہ اس افسانے کا خیال اس ناول سے پیدا ہوا لیکن قصہ بالکل ہندوستانی ہے اور قابل مبالغہ غور و فکر کا نتیجہ ہے —

ناگ کتھا

(مولفہ صاحبزادہ محمد عمر نورانی صاحبان -
مصدر بردرز تاجران کتب جموں قیمت آٹھ آنے)
(یہ کتاب انجمن ترقی اردو اورنگ آباد - دکن سے بھی مل سکتی ہے)

اس میں قدیم ہندوستانی ڈراموں کی سات کہانیاں اور ایک تاریخی کہانی ہے ۔
یہ بڑی دلچسپ کہانیاں ہیں اور قدیم ہندوستان کے نامور اور مستند ڈراما نگاروں کے
شہرہ آفاق ڈراموں کو اپنی میتھی اور پاک ستھری زبان میں اس خوبی سے ادا
کیا ہے کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے ۔ ہندی کے خوبصورت الفاظ جس حسن و خوبی
سے ان صاحبوں نے اپنی ان کہانیوں میں کھپائے ہیں یا تو مولانا حالی کو مناجات بیہوش میں
دیکھنے میں آئے یا یہاں ۔ اس چھوٹی سی کتاب پڑھنے کے بعد دل میں یہ خیال آتا ہے کہ
” ہندوستانی “ جو آئندہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہونے والی ہے وہ کہیں
پہلی تو نہیں ۔ اردو کے نامور ادیب اور شاعر حضرت کہنی نے کتاب کے شروع میں بہت
ہی پر لطف تقدیر لکھی ہے ۔ امید ہے کہ یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی اور پڑھنے والے
مولفین کی محنت کی داد دیں گے ۔ ایک بڑا فائدہ ان کہانیوں کے پڑھنے سے یہ ہوگا کہ جو
لوگ اپنی نارسائی یا کم فرصتی کی وجہ سے اصل ڈراموں کا مطالعہ نہیں کرسکتے وہ
” نقل مطابق اصل “ کو پڑھ کر ضرور محظوظ ہونگے اور کیا عجب ہے کہ بہت سے اصل کی
طرف رجوع کریں —

پرواز خیال

(مجموعہ کلام خواجه حمید الدین صاحب حمید لکھنوی)
ناسی پریس لکھنؤ قیمت ایک روپیہ چار آنے)

یہ خواجه حمید صاحب لکھنوی کی فزولوں کا مجموعہ یعنی دیوان ہے ۔ محفل
جیبی تقطع نہایت عمدہ کغذ پر خوبصورت چھپا ہے ۔ فزول گوئی میں قدیم اساتذہ کا
تذبح کیا ہے ۔ جو لوگ اس طرز کو پسند کرتے ہیں، اُن کے لائق ہے ۔ زبان صاف اور
رو بہ درست ہے ۔ کڑی خاص بات ایسی نہیں جو بیان کے قابل ہو ۔ چند اشعار بطور
نمونے کے لکھے جاتے ہیں —

یوں دفن مجھے کرنا ملے ہو سوے میٹھانہ
 اک ہاتھ میں ساغر ہو اک ہاتھ میں بھمانہ
 کہنے کو مسلمان ہوں مذہب تو ہے رندانہ
 توبہ ہے سوے لب پر فطریں سوے میٹھانہ
 منزل ہے وہی میری جس جا ترا جلوہ ہے
 اس سے نہیں کچھ مطلب کعبہ ہو کہ میٹھانہ

شہزادہ عناصر کا بکھرا نظر آتا ہے مشکل ہمیں اب اپنا چہڑا نظر آتا ہے
 سب ایک طرف، مجرم تنہا نظر آتا ہے اس عرصہٴ محشر میں یہ کیا نظر آتا ہے
 یہ حال نہ تھا پہلے اس دردِ محبت میں جو آج مجھے عالمِ دل کا نظر آتا ہے
 انسان کا چہرہ بھی آئینہ ہے عادت کا جیسا کوئی ہوتا ہے ویسا نظر آتا ہے
 دن رات ہے واعظِ کرتِ جنت و دوزخ کی ہم کو تو کچھ اس میں بھی دھوکا نظر آتا ہے

دیباچہ افسانہ

(مؤلفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری صاحب ایم۔ اے۔
 مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، صفحات ۲۰۰ چھوٹی تقطیع
 قیمت ایک روپیہ چار آنے)

کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں بیس باب ہیں۔ پہلے چودہ
 باب عام فسانے کی تاریخ، اس کے اقسام، عناصر، خصوصیات، موضوع، فرائض اور
 مختصر قصوں کے متعلق ہیں۔ لیکن آخری پانچ باب میں اردو کے فسانوں، ناولوں
 اور مختصر قصوں سے بحث کی ہے۔ یعنی اردو زبان اور فسانے؛ ابتدائی دور کے
 فسانے؛ فورت ولیم کالج کی کوششیں؛ اردو ناول، اردو مختصر فسانے اور اردو
 افسانوں کا مستقبل۔

قابل مؤلف نے اردو نثر کا پہلا فسانہ ابنِ نشاطی کے قصے ”طوطی فامہ“ کو
 قرار دیا ہے۔ ابنِ نشاطی کا طوطی نامہ منظوم ہے۔ معلوم نہیں نثر کس پنا پر لکھا
 ہے، اس کے لئے کوئی سند بھی پیش نہیں کی۔ اسی طرح شیخ عین الدین گدیج العلم کو
 اردو نثر کا مصنف بتایا ہے، اور یہ بھی بغیر سند اور تصدیق کے۔ خواجہ ہندہ نواز

گھسو داراز کے رسالے ”ہدایت نامہ“ اور ہفت اسرار“ بعد کے ترجمے ہیں، خواجہ صاحب نے اردو میں نہیں لکھے —

اردو ناولوں پر لکھنے کی ابھی گنجائش باقی ہے، چونکہ وہ اس مبحث پر الگ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے غالباً یہاں اختصار سے کام لیا گیا۔ تعجب ہے کہ اردو ناول نویسوں میں منشی یریم چغت صاحب کا نام نہیں ہے۔ اردو ناولوں اور ناول نویسوں کے متعلق قابل موف نے جو رائیں ظاہر کی ہیں ان سے بھی اکثر اصحاب کو اختلاف ہو گا۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس مضمون پر لکھی گئی اور مولف کی محنت اور تلاش بہت قابل تعریف ہے۔ جو لوگ ناولوں کے شائق ہیں یا جنہیں ناول نویسی کا ذوق ہے وہ ضرور اسے پڑھ کر خوش اور مستفید ہوں گے۔

اوتاروں کے قصے

(مولفہ سید محمد منظور علی رضوی صاحب نیشنل پریس)
(رام نرائن لال) الہ آباد قیادت چار آنے)

اس چھوٹی سی خوبصورت کتاب میں رام چندر جی کرشن جی اور مہابھارت کی لڑائی کا حال صاف سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی اور نازک کتاب کی زبان میں بڑا فرق ہے۔ یہ کتاب لڑکوں لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے خوب ہے۔ تین رنگین تصویریں بھی ہیں۔ رام نرائن لال صاحب اپنے نیشنل پریس سے اردو کی بہت سی اچھی اچھی کتابوں صاف ستھری چھاپ کر شائع کر رہے ہیں۔ ان میں کہانیوں کا بھی ایک سلسلہ ہے اور اس سلسلے کی ایک کتاب یہ بھی ہے —

اردوے معلیٰ

(از ستمبر ۱۹۲۸ء تا جون ۱۹۲۹ء مرتبہ جذاب)
سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی - کانپور)

یہ مشہور ادبی رسالہ اب رسالہ نہیں رہا بلکہ اس میں با قسط مستقل ادبی

کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ ایک کتاب ”معائب سخن“ مسلسل چھپ رہی ہے۔ علامہ اس کے بہت سے فایاد اور معروف دیوانوں کا انتخاب بھی شائع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان پڑچوں میں میر محمد حیات حسرت، یقین، احسن اللہ خاں بہان اور خواجہ کمال الدین شاعر (شاگردان مرزا مظہر) ذوق، داغ، رسا (شاگرد داغ) جگر مراد آبادی، فغان، راسخ، رونق، صدمہ، فانی، عزیز لکھنوی اور معشر لکھنوی کے دیوانوں کا انتخاب درج ہے۔ یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔ کبھی سرورق کے اوت میں ایک آدھ تارہ فزل بھی چھپ جاتی ہے۔ ستمبر تا دسمبر سنہ ۲۸ع کے پڑچے میں فہرہ رپوت پڑ جامع تہ صرہ ہے۔ اگرچہ بذات خود یہ ایک کام کی چھڑے مگر اردوے معلیٰ میں اس کا پیوند بے جزو سا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال جوان ہمت حسرت برابر کام میں مصروف ہیں اور اپنے ذوق کو بڑی خوبی سے نبھاتے جارہے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ یہ رسالہ سہ ماہی ہو گیا ہے کیونکہ تین تین نمبر ایک ایک رسالے میں پہنچتے تھے۔ اتنے میں جولائی کا نمبر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بدستور ماہانہ ہے۔ قیمت سالانہ دو روپے چار آنے اور فی پڑچہ تین آنے ہے اور معلومات کے لحاظ سے جو اس میں درج ہوتی رہتی ہیں۔ یہ قیمت کچھ بھی نہیں۔

ہزار داستان، علی بابا اور چالیس چور

مؤلفہ جذاب حامد اللہ صاحب افسر - رام نارائن لال
نیشنل پریس آلہ آباد قیمت فی کتاب چار آنے

یہ نیشنل پریس کے قصے کہانیوں کے سلسلے کی کتابیں ہیں۔ پہلی کتاب میں فتحچہ خیز چھوٹے چھوٹے قصے اور سبق ہیں۔ دوسری میں الف لہا کے مشہور قصے کو آج کل کی سادہ اور سلیس زبان میں لکھا ہے۔ اس میں دو تین رنگین تصویروں بھی ہیں۔ بچے ان کتابوں کو بہت شوق سے پڑھیں گے۔

کروسو سیاح (مؤلفہ جناب طالب الہ آبادی، نیشنل پریس الہ آباد، قیمت ۴۰ آنے)

وینس کاسیاح (مؤلفہ جناب سید محمد منظور علی صاحب نیشنل پریس الہ آباد، قیمت ۴۰ آنے)

یہ دونوں کتابیں بھی نیشنل پریس کے سلسلے کی ہیں۔ پہلی کتاب انگریزی کی مشہور کتاب رابن سوکروسو کا خلاصہ ہے اور دوسری مارکو پولو مشہور سیاح کے سہاحت نامے کا نہایت مختصر سا خاکا ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے شوق کی چیز ہے، نیشنل پریس بہت اچھا کام کر رہا ہے۔

خط لاتین برائے فارسی

(خطبہ جناب آقا سید محمد علی صاحب پروفیسر نظام کالج)

آج کل ایشیائی ممالک میں لاتینی حروف کا بہت چرچا ہے اور جب سے ترکی میں یہ حروف رائج ہو گئے ہیں، یہ بحث ارد بھی قابل غور ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور ایران میں اس پر بڑی بڑی گرم بحثیں ہو رہی ہیں۔ جاپان میں بھی بہت دنوں سے اس پر غور ہو رہا ہے۔ چین اور جاپان کے حق میں تو یہ حروف ایک قسم کی رحمت ہونگے اور اگر ان دونوں ملکوں نے یہ حروف اختیار کر لیے تو وہ ایک بڑی رحمت اور جلبال سے بچ جائینگے۔ لیکن ہزار ہا سال کے رواج کا یک لخت چھوڑ دینا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ آغا صاحب نے اچے لکچر میں فارسی میں لاتینی حروف کے استعمال کے متعلق بحث کی ہے۔ ان کی رائے اس استعمال کے بالکل مخالف ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے جو بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے :

- ۱۔ حروف ناقص ہوں۔ ایک ایک حرف کئی کئی آوازیں دیتا ہے۔
- ۲۔ لاتینی حروف فارسی حروف کی ضرورتوں کو کامل طور پر پورا نہیں کرتے۔ کیونکہ متعدد حروف اور اصوات ایسی ہیں جن کا وجود لاتینی میں نہیں پایا جاتا۔

ان وجہ کو قابل لکچرار نے فارسی اور لاتینی حروف کو بالمقابل لکھ کر

سمجھایا ہے۔

اس قسم کے نقص کچھ نہ کچھ ہر زبان کے حروف میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ خود قابل لکچرار نے فارسی حروف کا لاتینی حروف سے مقابلہ کر کے فارسی خط کے نقائص بتا دیئے ہیں۔

فارسی خط کی ایک خوبی یہ بتائی ہے کہ زرد فویسی کے لئے یہ بہت کارآمد ہے۔ لاتینی حروف میں تحریر بہت طویل ہو جاتی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ نقاشی کا بہترین نمونہ ہے۔

موجودہ خط کے بدلنے میں بڑا نقص قابل لکچرار کی رائے میں یہ ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مروجہ خط بالکل غہر مانوس ہو جائے گا اور صدہا سال کی محنت سے جو علوم و فنون پیدا ہوئے ہیں وہ سب ضائع ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایران پر ایک ایسا سانحہ گزر چکا ہے۔ یعنی جب پہلوی خط ترک کر کے عربی خط اختیار کیا گیا تو ایران کے قدیم علوم و فنون سب تلف ہو گئے۔

اس لئے آغا صاحب کی یہ رائے ہے کہ موجودہ خط ہی کی اصلاح اس طور سے کر لی جائے کہ ہمیں ایک جدید خط کی ضرورت نہ رہے۔ وہ اصلاح یہ ہے کہ اعراب میں جزم کو بالکل ترک کر دیا جائے یعنی جس حرف پر کوئی علامت نہ ہو وہ ساکن سمجھا جائے۔ تشدید کی علامت کی جگہ جزم رکھ لیا جائے۔ غرض یہ کہ مروجہ خط ہی میں کچھ اصلاح کر لی جائے۔

اردو خط بھی وہی ہے جو فارسی ہے۔ اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ ہم اس وقت تک الفاظ صحیح نہیں پڑھ سکتے جب تک دو اعراب نہ ہوں۔ اور اعراب کا لگانا دقت طلب امر ہے۔ اور ٹائپ میں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

اردو زبان کی حالت جو اس وقت ہے آئندہ یوں ہی نہیں رہے گی۔ اگر ہم اس کی اشاعت اور توسیع کے خواہاں ہیں تو لازم ہے کہ اس کا ٹائپ بنائیں۔ مروجہ نستعلیق خط کا ٹائپ بنانا نہایت دشوار ہے۔ اگر بن بھی گیا تو اس میں وہ سہولت نہیں پیدا ہو سکتی جو لاتینی حروف کے ٹائپ میں ہے۔ البتہ نسخ اختیار کر سکتے ہیں لیکن تلفظ کی صحت اس میں بھی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم لاتینی حروف لے لیں تو عمدہ سے عمدہ ٹائپ جو صدہا سال کی محنت اور کوشش سے بنا ہے، ہمیں بغیر کسی زحمت کے مل جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس میں بعض آوازیں نہیں ہیں تو ان کا بنا لہذا کوئی بڑی بات نہیں، بلکہ پہلے سے بنی بنائی موجود ہیں۔ ہندوستان میں بہت سی زبانیں مروج ہیں اور اکثر کے خط ایک دوسرے سے قریب ملتے۔ اگر یہ سب زبانیں لاتینی حروف اختیار کر لیں تو ان کا سیکھنا کس

قدر آسان ہو جائے۔ اور جو کچھ بھی ہو، اس منہجی اردو بحث کا تو پاپ کٹ جائے گا۔

عجیب بات ہے کہ جو خط نہایت خوش نما، اعلیٰ ترقی یافتہ اور مہذب اور نقاشی کا بہترین نمونہ ہے وہ اس زمانے میں جب کہ ٹائپ کی فرماں روائی ہے، اندول اور فاکارہ ثابت ہوا اور وہ خط جو ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ حالت میں تھا، مفید اور اعلیٰ بن گئے۔

مجھے اکثر اردو کی قدیم کتابوں کے مطالعے کا اتفاق ہوتا ہے۔ پرانے الفاظ کے صحیح پڑھنے اور صحیح تلفظ کے دریافت کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اُردو لکھنے یا ناگری حروف میں یہ تحریریں ہوتیں تو اتنی دقت نہ ہوتی۔

بحث اب حسن اور افادے میں آ پڑی ہے۔ یہاں تو حسن کی پوجا کھجئے اور ترقی سے ہاتھ دعو بیٹھئے یا پھر چھاتی پے پتھر رکھ کر حسن کو خیر باد کہئے اور ترقی و افادہ کے میدان میں آئدے۔

ایک روز ایسا آنے والا ہے کہ ہمیں یہ خط بدلنا پڑے گا، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی صورت کیا ہو گی۔ لیکن جتنی دیر دھوتی جائے گی اسی قدر مشکلات بڑھتی جائیں گی۔

فیضان شوق

(دیوان منشی احمد علی صاحب 'شوق'، قدوائی لکھنؤی مرحوم)
 حجم ۳۰۰ صفحے، سائز ۲۰ × ۲۶، قیمت دو روپے، لکھائی
 چھپائی، کاغذ بہت عمدہ، معہ تصویر مصنف، پتہ:
 خان بہادر شیخ رضی الدین احمد صاحب پھرسٹرائٹ لا
 گونڈہ (اودھہ)

مستصر الہدیان منشی احمد علی صاحب 'شوق'، قدوائی مرحوم اردو زبان کے ان اُستادوں اور مسلم الثبوت شعرا میں تھے، جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے آپ اپنی نظر تھے اور جن کی تمام زندگی اس فن شریف کی خدمت میں گزری ہے۔۔۔
 اس چند سال کے اندر نہایت السوس ہے کہ ہماری زبان کے کئی گراں پایہ انہما پرداز اور

شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے، اور زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اپنی خصوصیات اور کمالات بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتے گئے۔ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم، جناب شاد عظیم آبادی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، مولانا شرر لکھنوی، اور جناب شوق قدوائی اس دور میں ادبِ اردو کے زبردست ارکان تھے۔

حضرت شوق قدوائی ایک قادر الکلام، کلمہ مشق اور رنگ قدیم و جدید کے ملک تھے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مجموعہ اشداد ہستی تھے۔ ان کا دیوان اور غزلیں اگر دیکھیے تو مذاق جدید اور جذبات نگاری سے بالکل الگ ہیں، قدیم رنگ نمایاں ہے اور وہ بھی خاص ہے۔ لکھنؤ کا فرسودہ رنگ رعایت لفظی کا تو اتنا زیادہ نہیں مگر محاورات، ضرب المثل، بول چال نظم کرنے کی خاص کوشش کرتے ہیں، اور آواز کو آمد بخانے کی بھی۔ یہی ان کے دیوان کا امتیازی رنگ ہے۔ اس پر بھی شگفتگی اور برجستگی بہت ہے اور یہ کمال مشافی کی دایہ ہے کہ کلام گدجلک نہیں ہونے پایا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل زبانوں میں طبع آزمائی کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا زور زیادہ تو لفظی صنائع اور فنی خوبیوں تک ہے لیکن شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شعر کی اصل روح جو اُسے انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا دے وہ نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت کم۔ بخلاف اس کے ان کی نظمیں نہایت پاکیزہ ہیں۔ اور بعض تو جذبات کی صحیح ترجمانی کے لحاظ سے ملک میں بے حد مقبول ہوئی ہیں۔ خاص کر ”عالم خیال“ جس میں ایک ایسی خاتون کے جذبات و خیالات ظاہر کئے ہیں جو اپنے شوہر سے دور ہے، یہ اپنے گھر میں ہے اور شوہر پردیس میں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحوم کی ایک بے مثل فطرت ہے، خصوصاً ہماری تعلیم یافتہ مسلمان خواتون میں اس نے غور معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ اور نظمیں بھی بغایت دل پسند ہیں اور یہ اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر کسی صورت میں چھپے تو اچھا خاصہ حجم ہوگا۔ اور ہمارا یہ خیال ہے کہ مرحوم کے دیوان سے زیادہ اس وقت اُن کے مجموعہ نظم کی ملک کو ضرورت تھی۔

زیر تلیق دیوان میں غزلوں میں، مگر یہ غزلیں اس رنگ میں نہیں آج کل مقبول ہے۔ اگرچہ زیادہ حصہ آخر عمر اور درمیانی عمر کا ہے کیونکہ ابتدائی عمر کا کلام زیادہ تر ضائع ہو گیا، اور جو بچ رہا تھا اس کا بھی اکثر و بیشتر حصہ خود مصنف نے اپنے ذوق کے سبب قلف کر دیا۔ آخر دیوان میں چند اخلاقی قطعیں اور رباعیاں ہیں، مگر ان میں بھی جان شاعری کی وہی کمی ہے جو غزلیات میں ہے۔ ایک امتیازی خصوصیت دیوان کی یہ ہے کہ غزلوں میں زبان نہایت صاف و شستہ اور صحیح استعمال کی ہے اور اشعار کی تعداد بہت کم رکھی ہے، جو

معتقدہوں کی خصوصیت تھی، رعایت لفظی زیادہ نہیں، لیکن صحت زبان اور معیار اور درجہ الامثال بلندی کے سوا اور کوئی بات مشکل سے موجدانہ طور لب اور مذاق سلیم کے لئے دل چسپ ہو سکتی ہے۔

دیوان کے شروع میں مرحوم کے صاحبزادے شیخ ظاہر علی صاحب کا ایک صلیب کا دیباچہ ہے، اس کے بعد مراد علی معین الدین صاحب ہی اے (کنز) بوردستہ ٹیٹ لا لکھنو کا ایک بسیط مقدمہ ۲۸ صفحات کا ہے، جس میں مصنف کے سوانح حیات، خصوصیات کلام، خصائل، مزاج، تصانیف و کلام پر تھیرہ اور بہت سی باتیں آگئی ہیں، تاہم ہمارے خیال میں یہ مقدمہ ابھی تشنہ ہے۔ اس میں کئی اور اہم چیزیں رہ گئی ہیں ایک تو ان کے تصانیف کا ذکر تفصیلی نہیں ہے۔ بعض کا نام تک مذکور نہیں۔ دوسرے ان کے تلامذہ کا بالکل ذکر نہیں اس کے علاوہ بعض اور بھی قابل تذکرہ باتیں چھوٹ گئیں۔

دیوان اس مطالع سے شروع ہوتا ہے :

مرا حق مان کر بن تو مرا حاجت روا ہونا

کہ میں مانے ہوئے ہوں اے خدا تیرا خدا ہونا

پہلے مصرعے کے لفظ بن پر دوران طباعت میں بعث ہو چکی ہے، آخر میں تمام ”عقودت مند“ اسی نکتے پر پہنچے کہ اپنی کوتاہ نظری تسلیم کر لی جائے، اور اُن پر حرف نہ رکھا جائے، مطلع بجز مدہ رھنے دیا جائے لیکن یہ ہمارے خیال میں زبردستی ہے، جو بات سچ ہو وہ کہنی چاہیے کہ بن یہاں کسی طرح نہیں کہہ سکتا، ورنہ ردیف بیکار ہوتی ہے، کیا لکھنو میں اب کوئی ایسا زبان دان نہیں جو اس معنی کو حل کرتا، یا اسے کم از کم کتابت ہی کی غلطی سمجھ لیا جاسکتا۔ یہ مطلع طبع دیوان کے وقت ہمارے ایک دوست کے پاس بغرض استفہار آیا تھا تو انہوں نے یہ لکھ دیا تھا کہ یہ لفظ (بن) نہیں بلکہ (ہی) یا (بھی) ہے، اس صورت میں مطلع ٹھیک ہو جاتا ہے، اور شعرا نے بھی اپنی اپنی رائیں پیش کیں مگر عقودت مند کب مانتے ہیں۔ یہ پہلی غزل حمد میں ۷ شعر کی ہے مگر کوئی شعر خاص طور پر قابل ذکر نہیں، دو ایک شعروں میں ناکوار قلعید بھی ہے دوسرے صلیب سے مشقہ کلام شروع ہوتا ہے، پہلا مطلع یہ ہے :

بکتے بکتے تو، تو اے ناصح مرا سر کھا گیا

دل کھا مہرا تو پھر تیری گورہ سے کیا گیا

یہ ”تھری گورہ سے کرا گیا“ نظم کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ شعر وہ خود

جھٹ پسند کرتے اور شعر یہ جہوم جہوم کر سناتے تھے۔ ہر سرائے شعر مستطیل ہو :

کچھہ شباب آتے ہی آج اس پر توکل اس پر ستم
اک ذرا سا حسن کہا پایا کہ تو، اترا گیا

اس میں زبان کا جو لطف ہے، وہ تو اہل نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرعے
میں (کچھہ) کچھہ یونہیوں سا ہے، اور دوسرے میں ”ذرا سا حسن“ معشوق کے
لبے کہنا صحیح ذوق مصحف کے مدافعی ہے۔ سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی
شاعری مصحف کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی، تگز مہ و معادریہ بلندی ہے۔
اور فرماتے ہیں:

مردے ملہ پر کسی سے لے کے تجھہ کو پان کھانا تھا
ترے ہونٹھوں کو مہرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا
یہ آہوں چند میں نے کھیچ دیں صرف اوپرے دل سے
اڈر کی کب تمنا تھی فقط اُس کو ڈرانا تھا

آہیں کھیچ دیں، یا کھیچ لیں، دونوں ٹھیک نہیں۔ آہوں کھیچوں
ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں ”مردے ملہ پر“ بھی اچھا نہیں ہے۔
اس زمین میں یہ شعر خوب کہا ہے:

تمھاری، غھر کی، ناصح کی، اب تو سب کی سنتے ہیں
کسی کی ہم نہیں سنتے تھ وہ بھی اک زمانا تھا

حقیقت میں بہت پاکیزہ شعر ہے، یہ حالت ایک وقت انسان پر گذرتی

ہے اور پھر ضرور اس کی یاد آتی ہے —

ذہن کے مطلع میں بھی ایک بات نظم کی ہے، یہ اور اس قسم کے کثرت سے
اشعار ایسے ہیں، جن پر خود مصنف کو ناز تھا، اور بہت سے احباب و عقیدت مند
محض مروتاً شوق سے سنتے اور جوش و خروش سے داد دیتے تھے۔ آخر میں تو وہ
صرف لغت و زبان کی ضرورت مند کے لئے شعر کہا کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ
معاذرات نظم میں بلکہ جائیں تاکہ لغت کی کتابوں کے لئے سنداً آئندہ کام
آئیں فرماتے ہیں:

دل کھوتا ہے، ہم کو اس سے راز عشق نہ کہتا تھا
”گھر کا بھیدی لگا ڈھالے“ اتنا سمجھ رہتا تھا
کہوں ہلستے ہو، میں جو پرہلہ آج جنوں کے ہاتھوں میں
کچھہ دن گزرے میں نے بھی خوش رنگ لباس اک پہنا تھا

خوش رنگ لباس سے غالباً چونکیا لباس سوا ہے جو بعد کو شدت جنوں نے اتار

پھنکوا یا اب شاعر نلکا پھر رہا ہے اور لوگ اس فطری لباس پر ہنس رہے ہیں -
 یہ مقطع مہر تقی کی شاعری اور اُسی دور قدیم کی یاد دلاتا ہے :
 ہمت ہاری ، جی دے بہتھے ، سب لذت کھوٹی اے 'شوق'
 مرنے کی جلدی ہی کیا تھی ، عشق کا غم کچھ سہنا تھا

متقدمین کی طرح چھوٹی اور طویل بندوں میں ، آخر عمر میں بہت طبع آزمائی
 کی ہے ، مگر دل میں وہ درد ، وہ کسک نہیں ، نہ صدمہ مذاق شعری ، اور مصہبت
 کی چاشنی ہے - بعض بعض شعر ضرور قابل قدر ہیں ، یہ شعر بھی بڑے مڑے کا کہا ہے :
 آنکھ اس ادا سے اُس نے دکھائی کہ میں نے 'شوق'
 چپکے سے اپنا مے کا بھرا جام رکھ دیا
 کوئی نئی بات نہیں ، مضمون پامال و فرسودہ ہے لیکن زبان کی صدفی و سادگی
 اور بندھن کی برجستگی و چستی نے خاص مڑا پیدا کر دیا ہے - یہ شعر انہیں کے رنگ کا ہے:

وہ بد خو ہے ، اور تھکانا دھونڈیں دل بھلانے کا
 اب سے آئے گھر سے آئے ، نام نہ لیں گھر جانے کا

اس کے دوسرے مصرعے میں بھی ایک متعارف کامیابی کے ساتھ نظم کیا ہے -
 رامپور کے قیام میں جب کہ حضرت شوق کا آخری دور تھا ، وہ ایسی بندوں میں فکرو
 کرتے تھے ، قدرت کلام حاصل تھی - مگر رعایت لفظی اور متعارف بندی ہاتھ سے کہاں
 جاتی ہے - درد و اثر ، جذبات نگاری ، متعارفات ، جو تغزل اور شعر کی جان ہے ، بہت کم پائی
 جاتی ہے - البتہ کہیں کہیں کچھ جھلک ہے ، مثلاً

بو آتی ہے ساتھ ہر نفس کے کچھ جملے لگا کر اب کا سا

بیٹھ گیا 'شوق' ایک گلی میں کیا جانوں کہا جی میں آیا
 شہاب آیا ، وہ آنت دھارے میں نئی دولت ملی اترا رہے ہیں
 نہ پوچھو غم میں دل کے ضعف کا حال کہاں کا دل ہمیں اب کہا رہے ہیں
 جتلے تکرے ہیں دل نا کام کے سب نگیلے ہیں تمہارے نام کے
 پڑنی ہے تجھ پر فرشتوں کی نظر منہ چھپا اور سونے والے بام کے
 سن کے مہر انام بولے کون 'شوق'؟ سینکڑوں دلیلا میں میں اس نام کے

کیا مزیداد شعر کہے ہیں ، زبان کی سادگی قابل داد ہے ، اور سنئے :

کچھ دل کی سناؤں کچھ جگر کی بہتھو تو کہوں ادھر ادھر کی

ذہل کا شعر کہا لا جواب کہا ہے :
 دامن کو ذرا بچاے رہنا دنیا نہیں گرد ہے سفر کی

کت گئی عمر لکھتے لکھتے خط اور ابھی حال عشق مجمل ہے
 بہر حال دیوان شوق جیسا کہ مقدمہ نگار صاحب نے لکھا ہے ”زیادہ تر اس فرض
 کے لئے کہ آئندہ کے طالبان فن اور محققین زبان ان کے نتائج کتب بیہوشی اور پنبجہ سالہ
 تجربے سے فائدہ اٹھائیں“ مگر شاعرانہ دل فریدیاں بھی اس کے صفحات میں ملتی
 ہیں اور وہ قدیم طرز میں بھی بلندش سے بعض اوقات خاص لطف پہنچا
 کر دیتے ہیں۔ مثلاً :

ہم نہ مانیں کہ کھلی سرخی خواب آنکھوں سے
 پھوٹ نکلا ہے تو رنگ شہاب آنکھوں سے
 دو گھڑی کے لئے وہ آئے تو دو گھر لوگے
 لے گئے چھون کے دل سینے سے خواب آنکھوں سے
 کہا مشکل زمیں ہے جس میں (آنکھوں سے) ردیف ہے مگر کیا اچھے شعر
 اپنی مشاقی اور قدرت الکلاسی سے نکال لئے ہیں اور دیکھئے :
 اتنی تو اس نے کی مری دل سوزیوں کی قدر
 تربت یہ اک چراغ سر شام رکھ دیا
 گل ہو کے میں کیا ہنسنا ایسا نہ تھا قم میرا
 جنم کی طرح گزرا روتے ہی جنم میرا
 اس میں جنم گزرا باندھا گیا ہے ، خدا جانے یہ کہاں تک بلحاظ زبان ٹھیک ہے ۔
 نئے نئے قافیوں اور ردیفوں میں کثرت سے دیوان شوق میں غزلیں ملیں گی ۔
 یہ کہا خوب کہا ہے :

رو نے سے میرے کھل گیا ظالم پہ درد عشق
 ہچکی جو آئی ، ملہ سے کلیجہا نکل پڑا
 ’ذوق و ظہر کی طرح ہم لکھ چکے ہیں کہ حضرت شوق کو محاورہ بلندی و مثل بلندی
 کا جھوسا شوق ہے ویسا ہی مشکل زمینوں میں بھی کھنے کا ذوق و ماکہ رکھتے ہیں
 اور اسے اسے شعر نکالے ہیں کہ ان کی قدرت کلام کو مانڈا پڑتا ہے ۔ مگر ایسا رنگ
 ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ فرماتے ہیں :

میں فہر ہوں اس سے یہ کھنگ جائے تو اچھا
 دل اس کا مرے دل سے اٹک جائے تو اچھا

دل مرا تُوڑا تو اس کو کچھہ ملال آ ہی گھا
 اچے بچھن کے کھلو نوں کا خہال آ ہی گھا
 وصل کی شب مجھہ کھا کھا ہوئے دھر کے اے شوق
 اس کی ر چھا ئیں میں تھا نور سحر ہی کا سا
 کچھہ ہٹا رنگ اسکی مہندی کا تو لطف آنے لگا
 چاند کا تکرّار ہر فاخن پہ چمکا نے لگا
 دو شعر یہ بھی کیا خوب ہیں :

ہاتھوں سے مہذ چھپا کر دل مفت لو کسی کا
 یوں بھی کہیں ہوا ہے سودا ہنسی خوشی کا
 پا مردی جذوں نے کیا کیا دکھائیں سیریں
 وار فتنہ ہو گیا میں صحرای کی زندقی کا

یہ زمیں دیکھئے :

سر کو کسی معشوق پہ وار آؤں تو اچھا
 جن عشقی کا یوں سر سے اتار آؤں تو اچھا

اس قسم کا ابتدال مذاق ہمارے قدیم استادان فن کے کلام میں اکثر ہے ، اور

یہ نتیجہ ہے لفظی شاعری کا - ذیل کے شعر میں ایک بات پیدا کی ہے —

جبر شیوہ نہیں ارباب وفا کا ور نہ
 تو مقہد کشش دل کے اثر میں رہتا
 حسن خالق نے دیا تھا تو دیا تھا لیکن
 یہ بھی کیا اُس نے کہا تھا کہ ستم کر ہو فا
 جان! اب نہیں باقی ہے مجھے دفن کرا دو
 تم دل پہ نہ جاؤ یہ اچھلتا ہی رہے گا
 دل کا دینا مجھے کیا آپ ہی منظور ہوا
 پھٹ پڑی اُس پہ جوانی تو میں مجبور ہوا
 مہری قسمت سے ہوا نذر تغافل وہ بھی
 میں تو سمجھا تھا کہ جور اب ترا دستور ہوا

ناخن اب کاڑھیں ہر روزہ کے غم سے چھوٹا
مستقل لطف ہوا، داغ جو ناسور ہوا

ضعف میں بھی کام مثل رنگ چل ہی جائے گا
ہو نہ ہو جنہیں مرا پہلو بدل ہی جائے گا

ذیل کا شعر بھی آج کل کون پسند کریگا :

یاد آئے گا چھٹی کا درد، جس دن اے مسہم
اس لب معجز نما کا سامنا کرنا پڑا

اس زمیں میں ارد بھی شعر ہیں مگر ہمارے کام کا کوئی نہیں، 'ابتدال' کا ایک شعر

ارد دیکھو :

ہلہل سے لڑا دیتے ہیں گُل مجھے کو دکھا کر
دیتے ہیں وہ دھوکا کہ یہ ہے گال ہمارا

یہ شعر اچھا کہا ہے :

میں کس اہل بیت یہ دیکھوں ستم ظریف کا منہ
جواب ایک تبسم ہے سو سوالوں کا
یہ پوری غزل سلجھی ہوئی ارد اچھی ہے - پھر کہتے ہیں :

دل پڑا نظروں کی نیچوں میں تو کت ہی جاے گا
تکرے تکرے ہوئے پھر غمزوں میں بت ہی جاے گا

ہم وہ نہیں کہ حشر میں غافل ہوں آپ سے
مہدان ہی میں اٹھ کے قدم لہنگے دیکھنا

یہ شعر داد طلب نکل گیا ہے :

وہ دن فراق کا کہ نہ لائے خدا جسے
اس عشق میں بدا ہے بہر طور دیکھنا
کچھ سہارا مرے جملے کا رہا ہی کب تھا
ابھی مرنا نہیں تم نے یہ کہا ہی کب تھا

دل ہی قابو میں نہیں تجھے یہ جو قابو ہو تو کہا
یاس دونوں سے ہے اب دل ہو تو کہا تو ہو تو کہا
تب تو مارا مجھے حشر آیا تو گہرائے نا ؟
میں جو کہتا تھا کہ پچھتاؤ گے پچھتاؤ گے نا ؟

کوئی مقام نظر آگیا جو بن کا سا کہا جنوں کہ نے یہ ہے مرے وطن کا سا
یہ سب غزلیں مشکل زمیں میں ہیں، 'ارد' یہ زیادہ تر خود حضرت عقیق

ہی کی اختراع ہیں۔ شعر تقریباً ایسے ہی ہیں جیسے یہ مطالعے ہیں، یہ شعر فور طلب ہے :

چمن سے صبر ہے مجھ تک ہوا تو آنے دے

نہ بستنی کو مرے پلنجرے پہ کس صہاد

اس غزل میں کس 'بس قافیہ ہے۔ اور اس شعر میں 'پلنجر' ہر وزن

فاعلین کہا ہے، حالانکہ زبانوں پر تو 'پلنجر' ہر وزن فعلین ہے۔ مقصود شعر صرف بستنی کو باندھنا تھا اور کچھ نہیں۔ ایک یہ زمیں نکالی ہے :

سہزہ رنگوں پر لہراے 'شوق کبیں وہ تلک تو پھر؟

بھنگ کا کھانا سہل ہے لیکن موہیں لائیں رنگ تو پھر؟

عجب زمیں ہے 'اس میں شعر کہنا مشکل ہے۔ کلام موزوں الہتم ہو سکتا ہے۔

دوسرے مصرعے میں بھنگ کھانا محل تامل ہے بھنگ پینا زیادہ متعارف ہے۔

گا کلوں سے عارضی اس کا شہاب آیا نظر

گھونگھروں سے حسن رخ پادر رکاب آیا نظر

موت آگئی اب آئے تو کیا دو گئے تم آکر

کچھ نہند نہیں ہے کہ جگا دو گئے تم آکر

ہم بھی ہیں ولولوں پہ جو وہ ہیں اُمدگ پر

دونوں آتے ہوئے ہیں برابر کی جنگ پر

یہ سب شعر خاص اُن کے رنگ کے ہیں۔ یہ شعر کہا خوب کہا ہے :

دل پڑکھا کشاکش اسید و بہم میں دیر کبھی نظر ہے کبھی پاسبان پر

مضمون رشک اکثر شعرا نے باندھا ہے، حضرت شوق فرماتے ہیں :

اس رشک سے لکھا نہ کبھی میں نے شوق خط

آئے گا اس کا نام قلم کی زبان پر

یہ شعر بھی خوب کہا ہے اور ایسی زمیوں میں شعراے موجودہ کو ضرور فکر کرنا

چاہئے بلکہ ان کا عام رواج ہونا چاہئے کہ قہد و دیف سے آزاد ہوں۔ فرماتے ہیں :

وارفتگی عشق میں باقی نہ رہے ہوش

ہستی مری مجھ کو ہوئی اک خواب فراسوش

جس ستم گر نے کیا لاکھوں تمناؤں کا خون
یاد کر تی ہے تمنا پھر اس کو آج کل
”کو آج کل“ اس فزل کی زمیں ہے ‘ مگر پا کھڑے شعر نکالا ہے ۔ اور فرماتے ہیں ؛
ملنے والے چھوڑتے جاتے ہیں کج رو جان کر
جا رہے ہیں ہم دیار بیکسی کو آج کل
یہ کجرو کچھہ کھپا نہیں ۔ چند اور منتخب شعر لکھتا ہوں :

ظالم کی جفا کم نہ مرا درد جگر کم
ہے لاگ برا بر کی ادھر کم نہ ادھر کم
مل کے ہوئے جو آشنا ہم سے نظر ، نظر سے ہم
کم کے مرے جدا جدا ہم سے جگر جگر سے ہم

وہ ترس کھا کر جو دل سے مجھہ حزین کی سی کہیں
لب نمک پروردہ ان کے ہیں انہیں کی سی کہیں
غور جو کا بانی ہے اور کچھہ بھی نہیں
یہ مقتضایہ جوانی ہے اور کچھہ بھی نہیں

نفس کی چال ترے گھر سے چل کے جاتے ہیں
بہیں پھر آتے ہیں جب ہم نکل کے جاتے ہیں

ہے آئینے میں ایذا محو دیدار آپ ہی اب تو
وہ اپنی ناک چوٹی ہے کرفعار آپ ہی اب تو

گلیوں گلیوں ہم نے لاکھوں کلمے پھتر کھائے ہیں
لڑکوں نے دیوا نہ پا کر ناک چائے چبوائے ہیں

ان دونوں مذکورہ شعروں میں صرف دو مسکاورے باندھنا تھے ‘ وہ تو بلند گئے مگر
مذاق لطیف کا خون ہو گیا ۔ اور سنئے :

دل ہے فریادی کہ دست ظلم کا کل ہے دراز
بازدہ لو جوڑا کہ قصہ مختصر ہی کہوں نہ ہو

یہ فزل کھا خوب کہی ہے :

دل لہکے گئی ہے کہ جگر لے کے گئی ہے
کچھہ تو مرے پہلو سے نظر لہکے گئی ہے

اللہ کرے آج نہ پلٹائے اسے یا س
امید جسے جانب در لہکے گئی ہے
بادِ سحرِی ان کو سرا حال دکھانے
سوکھا ہوا اک برگِ شجر لہکے گئی ہے

ذیل کا شعر مصنف نے نکال دیا ، مگر ہمیں یاد رہ گیا تھا ، دیوان میں نہیں ہے :

برجھی سے کبھی مہلے چرایا نہیں پہلو
جب آئی ہے تب لختِ جگر لہکے گئی ہے

یہ غزل کیسی مشکل زمیں ہے مگر مطلع ہی سے اس کا اندازہ کر لیجئے :

روؤں اے ہادل تو جل تھل بھر کے چھوڑ دوں تو سہی
تجھ کو میں پا نی سے پتلا کر کے چھوڑوں تو سہی

”توسہی“ کی ودیف میں صرف اپنا کمال اور مشا قی دکھانا تھا۔ ابتذال کی حد ہو گئی
یہ شعر خوب کہے ہوں :

ہر روز ترقی پہ جو ہے حسن کی صورت
ایک ایک سے ملتی نہیں تصویر کسی کی
اس قافیے میں یہ شعر خوب کہا ہے اور مجھے بہت پسند آیا :
پہنچا ہے جنوں تک اثر جوہں گل ایسا
بہل سی چھلنے لگی زنجیر کسی کی
یہ مطلع بھی بہت پاکڑہ کہا ہے :

کیا قہامت ہے کہ چڑھتا ہے نہیں سے کوئی
روز اک دل انہیں دے لائے کہیں سے کوئی
کر پڑا ہا تھ سے آئندہ ، یہ ہم نے دیکھا
یو چھ اب اُن کے تعیر کو انہوں سے کوئی
ان بلاؤں نے کہاں سے سرا گھر دیکھ لیا
کہ فلک سے کوئی آتی ہے زمیں سے کوئی

وہ خوش کہ ہے جگر کو نظر میں لئے ہوئے
میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے
زلموں سے دل کو پھلک بھی دو ورنہ صبر بھر
بیٹھے رہو گے درد وہ سر میں لئے ہوئے

دوسرے مصوے میں 'درد کو' تھا پھر مصنف نے 'درد وہ' بنایا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'کو' اور 'وہ' دونوں برائے بہت ہیں - ذیل کا شعر کیا خوب کہا ہے حالانکہ زمین بہت مشکل ہے -

خدا ہی ہے مری توبہ کا جب ساقی کہے مجھ سے
اے پی بھی کہاں کی پارسائی لے کے بیٹھا ہے
دیکھنا اس کا نہ ہو اے شوق اگر مد نظر
آنکھ میں پتلی تو پتلی میں نظر ہی کہوں بنے
بچپن میں جو اُڑاتے تھے گل پر لہے ہوئے
سر آج اُڑا رہے ہیں وہ خلیجہ لیے ہوئے
قد جو اوروں سے ہے نیچا تو نہ سرماؤ تم
قاز سے باغ میں نخل گل تر نیچا ہے
دونوں شعر ابتذال ذوق کے گواہ ہیں اور ذیل کے شعر خوب ہیں :

ہماری جان وہ کیا لیں بدن میں جب ہو بھی
بدن بھی گھلے مٹا پھرہن میں جب ہو بھی
ہالہا ہل زبان ایسی جگہ 'جب ہو بھی' کی جگہ 'ہو بھی' اب کافی اور فصیح
سمجھتے ہیں —

دراز دستی زلف رسا کے ہم قائل
مگر کہاں دل وحشی بدن میں جب ہو بھی
چہرے کے وار پہ منہ سے دعا نکلتی ہے
کسی کا ہاتھ کسی کی زبان چلتی ہے
بتاؤں کیا شب فرقت میں سانس کی حالت
تمام رات چہری سے جگر پہ چلتی ہے
ہوا نہ بگڑے کہاں تک دیار الفت کی
تیری زبان تو ہو وقت زہر اُگلتی ہے
ہوا ہو، چاہے زمانہ ہو چاہے رنگت ہو
زیادہ سب سے تمہاری فطرت بدلتی ہے

مذکورہ غزل کیا خوب کہی ہے، مشکل زمیوں میں دو تین شعروں کی اور رحمت فرمائی ہے۔

تیر کو کہوں دوں کہ جس رخ جائے وہ دل لے کے جائے
دوں نظر کو جو پھرے اور سوے قاتل لے کے جائے
چہر کیاں ان کی سہوں میں یہ تو ممکن ہے مگر
مسکرا ہی کہوں نہ دیں غصہ اُتر ہی کہوں نہ جائے

یہ جذبات شوق قدوائی مرحوم کے رنگ تغزل پر ایک بسیط نظر تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے وہ پودا ہی نہیں ہوئے تھے۔ مگر زمانے کی بد مذاقی کی اصرار بھا لے گئی، اور پھر ایسا رنگ چڑھا کہ طبیعت ثانیہ بن گیا۔ ورنہ وہ صرف بیانیہ نظموں کے لئے پودا ہوئے تھے۔ اور ان کی بہت سی نظمیں بے مثل ہیں، بہت مقبول ہیں، کورس میں شامل ہیں، اور ادب ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے بلند اقبال صاحبزادے شیخ طاہر علی اور داماد لائق شہخ رضی المدین صاحب بھرستہ ان کی نظموں کو بھی اسی شان اور اہتمام سے جملہ چھپوا دیں گے۔ اور مقدمے میں جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے گی۔ تاکہ اس بلند پایہ شاعر کی اصلی کاروں فکر کے نتائج سے دنیا محروم نہ رہے اور یوں دیوان کے مطالعے کے بعد ناظرین مایوس نہ ہوں بلکہ اس کوفت کی پوری تلافی ہو سکے۔

عناصر اربعۂ رباعی (فارسی)

مؤلف مولوی مسعود علی صاحب بی۔ اے، ملنے کا پتہ : آقا سید محمد علی پروفیسر نظام کالج، حیدرآباد۔ دکن۔ قیمت ۶ آنے، حجم ۵۶ صفحے۔ سائز ۱۸ × ۲۲۔ لکھائی چھپائی، کافز متوسط

یہ ایک فارسی لکچر ہے، جو مؤلف صاحب نے ”شعبۂ جامعۂ معارف ایدران در حیدرآباد“ کے ایک جلسے میں ۲۱ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۴۳ھ کو دیا تھا، اور اب شائع ہوا ہے۔ اس میں رباعی کی تاریخ، اس کے اوزان مقدورہ کے بعد اپنے خیال کے موافق یہ بتایا ہے کہ فارسی ادبیات میں رباعی کے چار نمایاں عناصر بابا طاہر عربی، ابو سعید ابوالخیر، خیام اور سحابی استہر آبادی ہیں۔ ان نامور شعرا کے مختصر حالات بھی دیے ہیں اور کچھ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ رباعی پر یہ ایک اچھا خاصہ چھوٹا سا رسالہ ہے۔

غالب اور اس کی شاعری

از مولوی احمد الدین احمد صاحب مارہروی بی۔ اے، سائز چھوٹا۔ قیمت ۶ آنے، حجم ۴۰ صفحے۔ لکھائی، چھپائی، کافز متوسط۔ ملنے کا پتہ : سفہر بک ایجنسی۔ سبزی منڈی۔ آلہ آباد۔

یہ مسلمہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی روشن خیالی، تعلیم اور سلامت مذاق بڑھتی جاتی ہے، اتنی ہی غالب شناسی بھی ترقی کر رہی ہے اور کرے گی۔ یہ رسالہ

بھی حالی و پھلوری کی حقیقت کوئی نوا کی ایک صدائے باز گشت ہے۔ مولف نے مختصراً غالب کے کلام سے اس کا کمال ثابت کیا ہے اور یہ کہ حکمائے یورپ کے نزدیک حقیقی شاعری کیا ہے، شعر کی اصلی روح کیا ہے اور وہ غالب کے یہاں ایک بدرجہ اتم موجود ہے۔

مذہب

اسلام اور غیر مسلم

مولفہ: مولوی محمد حفیظ الدہ صاحب پھلوری۔ ملنے کا پتہ:
مسلم بک ڈپو پھلوری شریف ضلع پٹنہ (بہار) سائز چھوٹا۔
لکھائی، چھپائی، گفٹ متوسط۔ حجم ۷۲ صفحات، قیمت ۸ آنے

یہ اسلام کے خلاف اعتراضات کا ایک مفید تر دیدی رسالہ ہے اور اس قسم کے مفید رسالے جناب مولف اور بھی شائع کر چکے ہیں جو نہایت مقبول ہوئے ہیں۔ بعض کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے اسلام پر یہ ایک عام دشمنانِ اہلِ مذہب کا اعتراض ہے کہ وہ توار کے زور سے پھیلا یا گیا ہے۔ اس کا نہایت متین رد اس مختصر رسالے میں ہے۔

تعلیم

بچوں کا دستور العمل (یا) سیرت و کردار

مصنفہ: مولوی محمد عبدالرحمن صاحب رنہس۔ ملنے کا پتہ:
مکتبہ ابراہیمہ استھشن روڈ، حیدر آباد دکن قیمت آٹھ آنے
حجم ۶۰ صفحات

یہ چھوٹا سا رسالہ مولف نے بچوں کی ابتدائی تربیت اور اصلاح اخلاق کے لئے لکھا ہے قلم جلی ہے اور چھوٹے چھوٹے سبق ہیں۔ مثلاً: 'مدرسہ'، 'لباس'، 'وقف' کی پابندی، 'قرض'، 'حسد و غیورہ'، 'زبان مہل' ہے۔ جسے بچے بخوبی پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں، اور ان کے لئے مفید بھی ہے۔ بعض زبان اور کتابت کی غلطیاں الہامہ مصححہ اصلاح میں قیمت بھی زیادہ ہے اور نام بھی ہمارے خیال سے بھونڈا اور لوسا ہے —

فلسفۂ رنج و راحت

مصنف مولوی عبدالرب صاحب 'کوکب' مولوی فاضل اڈیٹر رسالہ اتالیق - حیدرآباد دکن - سائز چھوٹا - حجم ۵۶ صفحے قیمت دس آنے - لکھائی، چھپائی، کاغذ معمولی —

اس مثنوی میں مصنف صاحب نے یہ بتایا ہے کہ انسان کو ہر وقت خوش و مسرور رہنے کی کوشش کرنا چاہیے اور جو کچھ غم و آلام اسے ہوتے ہیں، ان کے اسباب وہ خرد پیدا کرتا ہے۔ ذوق سلیم ہو تو ہر شے سے آدمی انبساط حاصل کرسکتا ہے۔ مثنوی کا بیان زرا خشک ہے۔ اور شعری معاسن و دل کشی کم ہے۔ قیمت بھی بہت زیادہ ہے —

معیار الاخلاق عربی

از مولوی عبدالرب صاحب 'کوکب' مولوی فاضل مدیر رسالہ اتالیق حیدرآباد دکن - قیمت درج نہیں - ملنے کا پتہ: مولف، محلہ شاہ علی بندہ - حیدرآباد - دکن سائز ۱۸ × ۲۲ لکھائی، چھپائی، کاغذ نہایت خراب —

یہ ایک عربی کا مختصر رسالہ ہے۔ جسے مبتدی عربی پڑھنے والوں اور کم عربی کے لئے اخلاقی تعلیمی رسالہ سمجھنا چاہئے مختلف عنوانوں اور سرخیوں کو قائم کر کے اخلاق کی حقیقت، اخلاق شریفانہ، ذرائع اخلاق آسان عربی میں بتائے گئے ہیں —

گائے بیل

(مؤلفہ جناب محمد نصیر ہمایوں صاحب بی - اے - قومی)

کتب خانہ ریلوے روڈ ، لاہور) —

یہ صاف اور سادہ زبان میں چھڑتی سی کتاب گائے بیل پر ہے - اس میں گائے بیل کی فصل ، دودھ ، بوماریوں ، خوراک ، ان کی دیکھ بھال وغیرہ کے متعلق تمام حالات بہت اچھی طرح بیان کئے گئے ہیں - تصویریں بھی دی ہیں —

ظریف معلم جلد اول و دوم

مؤلفہ بابو ادیتہ پرشاد صاحب بی - اے ، ال - ال - بی ، وکیل لکھنؤ -

قیمت فی جلد ۵ آنے - ادیتہ بھون لکھنؤ)

قابل مؤلف نے باتوں باتوں ، لطیفوں ، چٹکلوں اور حکایتوں میں بچوں کو پڑھنے لکھنے کی چات لگائی ہے - اسی کے ضمن میں اخلاقی سبق بھی آگئے ہیں - اکثر سبق مکالمے کی صورت میں ہیں اور بہت دلچسپ ہیں - آج کل بچوں کے لئے بہت سی کتابیں لکھی جا رہی ہیں ، لیکن ایسی پر لطف کتابیں دیکھنے میں نہیں آئیں - زبان بہت صاف ستھری اور بامحاورہ ہے - کہیں کہیں سادہ تصریحیں بھی ہیں - بچوں کے لئے یہ بہت اچھا تحفہ ہے —

تاریخ و سیر

مزارات حرمین

مؤلفہ مولوی علی شہر صاحب - درشتہ دار انتظامی ہائی کورٹ حیدرآباد - دکن

مطبوعہ انوار الاسلام پریس - قیمت ۳ روپیہ ۸ آنے - حجم ۳۰۰ صفحات

سے زیادہ - مجلد فل کلاتہ - ۲۰ - ۲۶ - لکھائی ، چھپائی عمدہ گنڈ متوسط سفید

جناب مؤلف کا یہ سفرنامہ حرمین بھی ہے اور حقیقت میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مشہور مزارات و مقابر کی ایک جامع اور مفصل تاریخ ہے - جناب مؤلف

مذہب سے معصیت اور اسلامی درد اپنے دل میں رکھتے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف تھیں۔ وہ سنہ ۱۳۴۵ھ میں زہارت حرمین اور فریضۂ حج کے لئے گئے تھے اور ان سعود والی حجاز و نجد نے ایک عبا بھی مرحمت کی تھا۔ انہوں نے حرمین کے مزارات اور مقابر کا یہ تذکرہ نہایت قابلیت سے مورخانہ انداز میں لکھا ہے۔ اس خاک پاک میں چٹنے مزار اور قبرستان تاریخی و مذہبی رکھتے ہیں۔ ان سب کو جستمہ جستہ موصوف نے دیکھا اور ان کی موجودہ و سابقہ حالت کو لکھا ہے۔ موجودہ حالت تو وہ ہے جو سعودی حکومت نے شرفاً مقابر کی بلندی و پختگی کو ناجائز سمجھ کر انہیں ڈھا دیا ہے۔ اور سابقہ حالت کو موصوف نے عربی فارسی انگریزی کی تاریخوں اور یورپ و ایشیا کے سیاحوں اور حاجیوں کے سفر ناموں سے اخذ کر کے بیان کی ہے۔ اس حدیث سے یہ کتاب اہلی موضوع کے لحاظ سے تاریخ کی ایک اہم کتاب ہوگئی ہے۔ اور اب تک غالباً اس خاص موضوع پر عربی فارسی میں بھی کوئی کتاب نہ تھی۔ بیان میں کہیں مذہبی غلو نہیں ہونے پایا ہے اور زبان بھی صاف شستہ ہے، جا بجا جغرافیہ و تاریخی نوٹ دے کر اور زیادہ کتاب کو مفید بنادیا ہے، اب یہ مسلمانوں کے ان مقدس مقامات کے متعلق تاریخی معلومات کا مفید عمدہ ذخیرہ ہوگئی ہے۔

وحیات جلیل

یعنی تذکرۂ علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی، مؤلفہ جناب مقبول احمد صاحب
صمدنی۔ دو حصوں میں۔ تعداد صفحات تقریباً چھ سو۔ مطبوعہ
۱۶ ذرائع لال الہ آباد۔ قیمت تین روپے

اس کتاب میں ہندوستان کے ایک نامور فاضل علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس کے ضمن میں بہت سے مشاہیر اور مقامات واقعات کا ذکر آگیا ہے جو تاریخی لحاظ سے بہت ہی قابلِ وقعت ہے۔ کوئی صفحہ حواشی سے خالی نہیں۔ حواشی بجائے خود کتاب سے کئی گنا زیادہ ہیں، جو بعض اوقات بہت طویل اور کہیں کہیں غیر ضروری نظر آتے ہیں، لیکن تاریخ کے شائق کے لئے وہ بہت کار آمد ہیں۔ فاضل مولف نے اس تذکرے کو نہایت تحقیقی دلی شوق اور کمال محنت سے لکھا ہے۔ مددگار کتابیں کہنگال دالی ہیں اور کوئی مآخذ جسے اس مضرع سے بعد تعاقب ہی تھا، ان کی نظر سے نہیں بچا۔ قابلِ مؤلف کی نظر اور معلومات بہت وسیع ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر سچی خوشی ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ مولف نے لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

کہنے کو تو علامہ میر عبدالجلیل کا تذکرہ ہے لیکن در اصل اس عہد کا تاریخی مرتع ہے۔ جو لوگ اٹھتے بیٹھتے کتابیں لکھتے جاتے ہوں اور تحقیق و معیت سے جی چراتے ہیں، ان کے لئے سبق اور جو اس رستے پر چلنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اعلیٰ نمونہ ہے۔ ہر لکھنے والے کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بغیر مسلسل معیت اور جانکامی کے کوئی اچھی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔

جن صاحبوں کو ہندوستان کی تاریخ اور حالات سے ذرا بھی لگاؤ ہے وہ اسے ملکا کر ضرور پڑھیں۔
یہ معلوم کر کے اور بھی خوشی ہوئی کہ وہ میر غلام علی آزاد بلکار اسی کے سوانح و حالات لکھ رہے ہیں۔ وہ کتاب اس سے بھی زیادہ قابل قدر ہوئی۔

اُردو کے جدید رسالے

ادبی دنیا

(ماہانہ - چیف ایڈیٹر جناب قاجور نجیب آبادی، ایڈیٹر جناب حذیف ہاشمی

لاہور - سالانہ چندہ تین روپے بارہ آنے)

یہ نیا رسالہ بہت آب و تاب کے ساتھ، بہت بڑی تقیطع پر جناب شیخ سر عبدالقادر کی نگرانی میں لاہور سے نکلتا شروع ہوا ہے۔ سر عبدالقادر کو اردو زبان سے خاص لگاؤ ہے، انہوں نے اردو کی بہت خدمت کی اور کبھی اس سے غافل نہیں رہتے۔ ”ادبی دنیا“ کو ان کی سرپرستی مبارک ہو۔ چیف ایڈیٹر جناب قاجور بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ نئے نئے تہذیب سے اردو کی اشاعت اور فروغ کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لاہور کی سوسائٹی اور وہاں کے اخباروں اور رسالوں میں ان کا اثر کچھ کم نہیں:

پہلے رحالے میں پہلا مضمون ”ادبی دنیا کا مقصد اشاعت“ ہے جسے ”ایک انقلابی

ادبی پروگرام“ سے موسوم کیا گیا ہے اس مقصد یا ”انقلابی پروگرام“ کا خلاصہ یہ ہے۔

۱ - ”تصانیف اردو کو عام بنانے کے سمجھنے والوں کی تعداد کو بڑھانا“:

۲ - ”اردو ادب کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے سرمایہ دار بنانا“۔

۳ - ”اردو انشا پر دازی اور شاعری پر آسان زبان میں تعلیمی زبان کے ذریعے نوجوانوں

اور طلبہ میں صحیح ذوق ادب پیدا کرنا“۔

۳ - ”اردو شاعری کو بہت سی غیر قدرتی پابندیوں سے آزاد کر کے آزاد زبانوں کی شاعرانہ خوبیوں کا اس میں اضافہ کرنا۔“ -

(ب) اردو گرامر میں ضروری تغیر و تبدل اور ایسے نئے قواعد کا اضافہ کرنا جن کی موجودگی میں جدید الفاظ، جدید تراکیب اور جدید محاورات صحیح قرار

دیے جائیں جو اردو کی شرائط میں خون کی طرح پھیل گئے ہیں۔“ -

(ج) ”دوسری زبانوں کے ایسے آسان اور خوشگوار الفاظ اردو میں داخل

کرنا جن کے ہم معنی لفظ اردو میں نہیں ہیں یا جن کا مفہوم ہم معنی

لفظ کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور خاص معنی کا حامل ہے۔“ -

اخباری قلمی سے قطع نظر کی جائے تو یہ مقاصد، اگرچہ نئے نہیں مگر بہت

معقول اور بہت خوب ہیں۔ ضرورت صرف عمل کی ہے۔ اردو اور ہندی پر یہ بجا

اعتراض ہے کہ ان کے لکھنے والے زبان مشکل بناتے جاتے ہیں، لیکن اس کی وجہ

بالکل یہ نہیں ہے کہ ان کے انشا پرداز خواہ منخواہ دھونڈ دھونڈ کر عربی اور

سنسکرت کے لفظ اپنی عبارت میں داخل کرتے ہیں بلکہ ایک مجبوری بھی ہے۔

جدید تعلیم اور جدید علوم کی وجہ سے جو نئے نئے خیالات، نئے نئے اسلوب اور نئے نئے

مفہوم پیدا ہو رہے ہیں، ان نے ادا کرنے کے لئے ان زبانوں میں سخت دشواری ہو تی

ہے۔ جو لوگ اس سے بے خبر ہیں، وہ اس دشواری کو نہیں سمجھ سکتے اور جنہیں

ان چیزوں سے سابقہ ہے وہ جب خون جگر کھا کر کچھ لکھتے ہیں تو ہمارے شاعر اور

انشا پرداز اس پر فک بھون چڑھتے ہیں۔ زبان کی سلاست اور صفائی الفاظ پر نہیں،

خیال کی صفائی اور سلاست پر ہے۔ پھر مضمون طرح طرح کے ہیں، ہر مضمون کے لئے

ایک سی زبان استعمال نہیں ہو سکتی۔ اور پھر اپنی اپنی طبعیت ہے، طرزِ تحریر

کا انحصار ہر شخص کی طبعیت پر ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے مشکل اور آسان اضافی

چیزیں ہیں۔ جو چیز کل آسان تھی آج مشکل ہے، اور آج جسے مشکل کہتے ہیں

کل آسان خیال کی جائے گی۔ نئے نئے خیالات کے ادا کرنے کے لئے جب لفظ نہیں ملتے

تو انہیں مجبوراً عربی اور سنسکرت کی طرف ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے۔ باوجود اس کے

ہم فاضل اذیتگر سے بالکل متفق ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو صاف شہتوی اور سلیس زبان

لکھی جائے۔ مگر اس کا کیا علاج جب خود اذیتگر صاحب ایسی زبان لکھتے ہیں جو ان

کے بیان کردہ مقصد کے خلاف ہے۔ دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں :

”کیا اس قلاش اور گدا گدائی کو بھی جو جو تیار نغمہ اندر بھیج رہا

تھا ان جذبات کا احساس تھا جو ایک غیر مرئی سامع کے دل میں ماضی

کی ایک آواز کی طرح بھڑک رہا تھا۔“ -

”اس مرتعش آواز کی المناک یاد تازہ کردی“

”جس سے طبیعت پر ایک سائر فی المنام مغنی کی الجھی ہوئی یا جلون

خود فراموشی کی سی کھفت طاری ہو جاتی“ —

”بی - اے مہن پنجاب ہرنیور سستی کا ویکارتہ بہت کیا“ - (بہت

کا لفظ کس قدر مکررہ ہے)

یہی مضامین نگاروں کے مضامین کی حالت ہے۔ حالانکہ اس مقصد کو پھس نظر رکھ کر وہ

وہ مناسب اصلاح کر سکتے ہیں تا کہ کم سے کم مطلب تو سمجھہ میں آجائے یا بے رابطی قائم نہ رہے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیے :

”مادام دولاں کی شہرت کا سکہ جملے سے پہلے بھی اس نو عمر لڑکی پر بہت سے

نوجوانوں کی نگاہیں اٹھ رہی تھیں“ (یہاں مادام دولاں اور نو عمر لڑکی

دو الگ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہیں)

”اس سے اس کی انقلابی روح کا معیار معلوم ہوتا ہے“

”وہ اپنی غیر سلاست زبان ارد قادر الکلامی سے اعصاب کی آخری مد ہوشی

کو بھی بھان کر جاتا ہے“

”آہ! خوفناک شعور کے طویل وقفوں کے ساتھ مہن نے شہاب پی“

”اس کا انجام کارکنان قضا و قدر کے ہاتھوں حسرت پر ستوں کا انتہا ہے

تسخیر معلوم ہوتا ہے“ —

یہ چند جملے اعتراض کی نظر سے نہیں لکھے گئے، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس

اصول پر عمل کس قدر دشوار ہے۔ شاید اسی خیال سے اذیتور صاحب ہر پرچے کے

آخر میں مشکل الفاظ کا فرہنگ بھی لکھ دیتے ہیں، لیکن اس سے

کچھ کام نہیں نکلتا —

سب سے مشکل آخری مقصد ہے۔ اب تک جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں

ان میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس میں اس مقصد کی تکمیل میں

کوشش کی گئی ہو۔ البتہ مختلف زبانوں کے نظم و نثر کے ترجمے ضرور پیش کئے گئے ہیں

لیکن وہ ایسے نہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے —

باوجود ان تمام باتوں کے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ’ادبی دنیا‘

اردو رسالوں میں خاص وقعت رکھتا ہے۔ اس نے غور و فکر اور دلچسپی کا بہت

اچھا سامان ہم پہنچایا ہے اور اچھی اچھی تصویروں سے رسالے کی دلکشی میں

اضافہ کیا ہے۔ ہماری رائے میں وہ مخزن اور زیر نگ خیال کے بھون بھون ہے۔

اس نے جن و مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے وہ بہت قابل قدر ہیں اور ہماری دلی

تسا ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو —

پیام تعلیم

(جامعۃ ملیہ اسلامیہ دہلی کا پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ -
سالانہ چندہ دو روپے)

یہ رسالہ حقیقی طور پر تعلیم کا پیام ہے - بہت سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے - ہندوستان کے تعلیمی حالات اور عام تعلیم پر بہت اچھے اچھے مضمون ہوتے ہیں بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے مضمون اور قصے کہانیاں الگ ہوتی ہیں - طالب علموں، بچوں اور بڑوں سب کے لئے بہت ہی اچھا پرچہ ہے - اس کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا ہے اور یہ بڑی بات ہے - چندہ بھی بہت کم ہے —

مبصر

(ماہانہ ' لکھنؤ - مصر : جناب ابوالعلاء ناطق '
معاون : جناب حکیم آشفتمہ - چندہ سالانہ چار روپے)

انکشاف

(ماہانہ لکھنؤ - اڈیٹر جناب سید معتمد نسیم ' چندہ سالانہ دو روپے)

خضر راہ

(ماہانہ لکھنؤ - اڈیٹر جناب حامد علی ' چندہ سالانہ چار روپے)

یہ تینوں رسالے لکھنؤ سے شائع ہوتے ہیں - خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ میں اس قسم کا علمی فوق پیدا ہوتا جاتا ہے - ان سب میں ' مبصر ' کا پایہ بلند ہے - علمی اور ادبی مضامین بہت اچھے ہیں - نظم اور افسانے کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے اور رسالے کو ترقی دینے کی ہر طرح کوشش کی جاتی ہے —

رسالہ انکشاف لکھنؤ کے محکمہ عالیہ اسلامیہ ایک آنہ فنڈ کی جانب سے شائع ہوتا ہے اور اس کی آمدنی مساجد کی موصمت اور مدارس کی ترقی میں صرف کی جاتی ہے۔ یہ مقصد بہت مستحسن ہے۔ لیکن سوال اس میں ہے کہ آیا یہ رسالہ محکمہ عالیہ کے لئے آمدنی کا باعث ہو سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بجائے فائدے کے نقصان ہو۔ ادبی اور تاریخی مضامین کے ساتھ مذہبی مضامین بھی درج ہوتے ہیں۔ اگرچہ تفسیر کلام پاک اور باب الفتاویٰ کے ساتھ دیگر عصمت، معصوم صورت اور فریب نظر جیسے قراءے اور افسانے اور معمولی غزلوں کچھ بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں تصویروں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

خضر راہ بھی اردو کے عام رسالوں کی طرح اردو ادب کی ترقی کا کوشاں ہے۔ اس میں بھی دوسرے رسالوں کی طرح نظم و فکری دونوں ہوتی ہیں۔ کوئی خاص بات ایسی نہیں جو استہازی ہو۔

کامیابی

(حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ کا ماہانہ رسالہ)
اڈیٹر ڈاکٹر احمد سعید صاحب بریلوی سالانہ قیمت در روپے دہلی)

حال ہی میں ایک لمیٹڈ کمپنی ”حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی“ کے نام سے دہلی میں قائم ہوئی ہے جس کا مقصد اردو کتب کی اشاعت، نئی کتابوں کی تالیف ہے۔ یہ خیال بھی خواجہ صاحب کے دماغ کی اچھ ہے۔ بہت اچھی سوچ ہے، اگر اس کا انتظام اچھے ہاتوں رہا اور کام قاعدے اور اصول سے ہوا تو اسے بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہئے۔ یہ رسالہ اس کمپنی ہر کام کے مقاصد کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بہت اچھے اچھے مضامین شائع کرتا رہتا ہے۔ رسالے کا مقصد ”مسلمانوں کی علمی، ایجاداتی اور اجتماعی قوتوں کو بیدار کرنا اور ان کو ترقی و کامیابی کا بہترین طریقہ بتانا“ قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ رسالہ ان مقاصد کو ابھی کماحقہ انجام دینے سے قاصر ہے، لیکن بہت سی دلچسپ چیزوں کا مجموعہ ہے اور عمدہ مضامین کے ساتھ معمولی چیزیں اور رطب کے ساتھ یا بس اور متانت کے ساتھ ظرافت اور چھوٹی بڑی معلومات سب کو اس طرح سمو دیا ہے کہ پڑھنے والے کو شکایت نہیں ہو سکتی۔ اس قدر ساز و سامان کے ساتھ سالانہ چلندہ بہت ہی کم ہے۔

امداد باہمی

(ماہانہ ، قادیان - آڈیٹر شیخ محمود احمد عرفانی صاحب ،

سالانہ قیمت چھ روپے)

امداد باہمی بہت مبارک تحریک ہے اور ہندوستان میں اب اس کے فوائد ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اس رسالے کا مقصد یہی تحریک ہے۔ اس میں مختلف انجمنوں کے حالات ، زراعت وغیرہ کے متعلق مفید معلومات ہوتے ہیں۔ رسالہ اپنے مقاصد کو خوبی سے انجام دیتا ہے اور جو لوگ اس تحریک کے قدر دان اور حامی ہیں وہ اس کی ضرورت قدر کریں گے —

ایجوکیشنل گزٹ

ماہانہ - جالندھر - آڈیٹر - شیخ محمد جان صاحب بی - اے ،

بی ٹی ؛ لالہ دیلا ناتھ دو ساچ بی - اے ، بی ٹی ؛

سردار وطن سنگھ بی - اے ، بی ٹی ؛ مہد معصن نرسنی

منشی فاضل و ادیب فاضل - سالانہ چلندہ تین روپے)

مقصد رسالے کے نام سے ظاہر ہے۔ اگرچہ یہ رسالہ دو تین سال سے جاری ہے لیکن اب خاص اہتمام کیا گیا ہے اور اس کے حجم اور مضامین میں بہت ترقی نظر آتی ہے۔ تعلیمی مضامین خاص طور پر بہت مفید ہیں اور غور و فکر سے لکھے جاتے ہیں۔ علاوہ تعلیمی مضامین کے ادبی ، معاشرتی تاریخی اور زرعی مضامین بھی درج ہوتے ہیں۔ تمام مضامین کا معیار مقاصد کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ اور رسالہ بہت مفید اور کارآمد ہے۔ تعلیمی رسالے اس حیثیت اور نوعیت کے بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ رسالے کے آخر میں ایک ضمیمہ ”رہنمائے اطفال“ کے نام سے شامل ہے جو جلی خط میں ہے اور اس میں بچوں کے لئے بہت سی مفید معلومات اور چھوٹے چھوٹے مضمون آسان ، نظمیں اور اُن کے کام کی باتیں ہوتی ہیں —

رسالہ کمیکل سوسائٹی

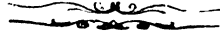
(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - اڈیٹر جناب محمد لطیف قریشی بی - ایس سی - اسسٹنٹ اڈیٹر ذوالفقار الحسنین صاحب - سہ ماہی - سالانہ چلندہ دورہ) —

یہ رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے شائع ہوا ہے - یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی اسی زمانے میں علمی تحقیق اور علمی کاموں کی طرف متوجہ ہے - یہ رسالہ دو حصوں پر مشتمل ہے - ایک حصے میں اردو مضامین ہیں اور دوسرے میں انگریزی - اردو انگریزی کا میل علی گڑھ کالج میں ابتدا سے چلا آ رہا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ شان اب تک قائم ہے - مضامین ایسے ہیں جسے ہر لکھا پڑھا شخص شوق سے پڑھ سکتا ہے اور کچھ نئی معلومات حاصل کر سکتا ہے - حتی الامکان دقیق اصطلاحات کے استعمال سے احتراز کیا گیا ہے اور مطالب کو صاف اور سہل طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے - یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انجمن ترقی اردو اور جامعہ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات نے مابک میں قبولیت حاصل کر لی ہے - چنانچہ اس رسالے میں بھی جگہ جگہ ان اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے - رسالہ بلاشبہ ملک کے لئے مفید ہے اور اس کے ذریعے سے اس علم کے سمجھنے میں عام طور پر سہولت ہوگی - علم کی پیمہ پر دنیا کی آمدنہ ترقی کا بہت کچھ انحصار ہے اور اسے مقبول بنانا ایک ملکی خدمت ہے —

مسیحائے زمان

(ماہانہ - تجارتی ، الور - مدیر قاضی حکیم سید محمد کرم حسین صاحب - قسمت سالانہ دو روپے) مقام تجارتی (ریاست الور) راجپوتانے کا یہ پہلا ماہوار علمی و ادبی و طبی رسالہ ہے - اس میں ایک آدھ مضمون تجارت پر ہے اور چند مفصلہ طبی ہیں - کچھ مجرب نسخے بھی درج ہیں - نوجوانوں کی غلط کاریوں کے مٹاؤ بھی معلومات ہیں اور سب سے زیادہ دواؤں کے اہتمامات ہیں - شاید یہی اس رسالے کی فرض اشاعت ہو —

چمنستان شعرا



ایک قدیم و نایاب اردو زبان کے شاعروں کا تذکرہ ہے ، جو انجمن ترقی اردو نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے ، اور اس کی تصحیح و ترتیب میں نہایت محنت و کوشش سے کام لیکر ایک دل چسپ و محققانہ مقدمے کے ساتھ چھاپا ہے ۔ تذکرے کے مؤلف (دکن) کے مشہور مورخ و تذکرہ نویس لالہ لچھمی فرائن ، شفیق و صاحب ، ہیں ۔ سنہ ۱۱۷۲ھ میں یہ تذکرہ تالیف ہوا ، اور دنیا میں اس کا صورت ایک نسخہ ہی پایا جاتا تھا ۔ عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی اے ۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو کا مقدمہ بھی قابل دید ہے ۔ حجم تقریباً ۶۰۰ صفحات ۔ جلد نہایت اعلیٰ قسم کی قیمت مجلد پانچ روپے آٹھ آنے سکے انگریزی غیر مجلد چار روپے بارہ آنے سکے انگریزی ۔

الہ ————— ش ————— تہر

مہتمم دفتر انجمن ترقی اردو ، اورنگ آباد (دکن)

انجمن کے مطبوعات

— (مفزون ذکات) —

یہ اردو شعرا کا نایاب تذکرہ ہے۔ مصنفہ شیخ محمد قیام الدین 'قائم' چاندپوری۔ شروع میں مولوی عبدالعقی صاحب ہی۔ اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کا ایک مقدمہ ہے جس میں اس تذکرے پر مفصل تبصہ کیا گیا ہے اور آخر میں قائم کے کلام کا انتخاب بھی دیدیا ہے۔ قیمت فی جلد مجلد تیسرے روپہ —

— (ذکر میر) —

ہندوستان میں کون ایسا صاحب ذوق ہرگز جو اردو کے خدائے سخن حضرت 'میر' کے نام اور کلام سے نا آشنا ہو ان کے کلام کا پاکیزہ انتخاب عرصہ ہوا کہ انجمن نے شائع کیا تھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا۔ اور کئی بار چھپ چکا ہے۔ اب خاص اہتمام سے میر صاحب کی یہ نادرہ روزگار سوانح عمری طبع کی گئی ہے۔ جو خون انہیوں کے پر سوز و گداز قلم کی تراش ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی اور اس وقت کی فضا نے پختہ آخری دور مغلیہ کی تصویر نہایت دل کش انداز سے کھینچی ہے۔ اور انجمن نے اپنے مخصوص و خواہی نہا تائب میں چھاپی ہے۔ شروع میں جناب مولوی عبدالعقی صاحب مدظلہ معتمد انجمن کا مقدمہ بجائے خرد قابل دید اور کتاب کی جان ہے۔ جلد خوب صورت حجم ۱۸۰ صفحے قیمت دو روپے —

— (بزم مشاعرہ) —

گذشتہ سال ماہ تھر (مئی و جون) میں عالی جناب مہاراجہ کشن پرشاد 'شاد' مدظلہ العالی صدر اعظم دواست آصفیہ دکن نے اورنگ آباد میں شرف ورود فرمایا تھا۔ جناب معتمد کی تشریف آوری پر اور دل چسپ ہنگاموں کے علاوہ ایک نہایت

الوشہ

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل لیستیں سکے انگریزی میں ہوں —

پر تکلف ، دل فریب مشاعرہ بھی حضرت موصوف کی صدارت میں بمقام مقبرہ ہوا ۔ اس مشاعرے کا گلدستہ نہایت خوش نما ، نظر فریب دو رنگوں میں طبع کیا گیا ہے ۔ شروع میں جناب صدر مدظلہ کی پاکیزہ تصویر اور جناب صدیقی کے قلم کا دل پذیر دیباچہ بھی ہے ۔ سر ورق بھی خوب صورت اور شاندار ہے ۔ آخر میں وہ قصائد بھی شامل کردے گئے ہیں جو اورنگ آباد کالج میں پڑھے گئے تھے ۔ نفاست پسند ارباب ذوق کے لئے بہت تھری تعداد میں یہ گلدستہ طبع ہوا ہے ۔ جلد منگوائیہ قیمت آٹھ آنے —

— (قاریخ اخلاق یورپ) —

اس کتاب کے اصل مصنف پروفیسر لیکنی کا نام علم و تبصرہ ۔ تحقیق و صداقت کا مرادف ہے ۔ یہ کتاب کئی عمارت برس کے تمدن ۔ اصول اخلاق ۔ مذاہب و خیالات کا مرقع ہے ۔ مترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب بی ۔ اے ، جلد اول مجلد ۳ روپے جلد دوم مجلد دو روپے ۸ آنے —

— (ہماری شاعری) —

مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ، ایم ۔ اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالہ اردو میں شاعری پر ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو عام طور پر بہت پسند کیا گیا تھا اب رضوی صاحب نے اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے کتابی صورت میں کر دیا ہے ۔ اور انجمن ترقی اردو نے اسے نہایت عمدہ طور پر پوری کتاب دو رنگوں میں (لکھنؤ میں) طبع کرائی ہے ۔ پورے کپڑے کی خوشلما جلد ہے ۔ حجم دو سو صفحے ، قیمت دو روپے —

— (کلیات ولی) —

ولی دکنی کے نام سے کون اردو دلی واقف نہ ہوگا ۔ اسے اردو شاعری کا بابا آدم کہتے ہیں اردو بھی گویا ہماری شاعری کا قدیم اور ممتاز ترین علم بردار ہے ۔ اس کا کلام اس زمانے کی زبان اور شاعری کا بہترین اور کامل مرقع ہے —

یہ کلیات جناب احسن ، سارووی نے نہایت معصن اور قابلیت سے مرتب کیا ہے ۔ اور انجمن ترقی اردو کے جدید ترین مطبوعات میں ہے ۔ اب تک ولی کے جو دیوان کہیں کہیں چھپے اور ملتے ہیں ۔ اکثر غلط اور نامکمل ہوں ۔ یہ کلیات ۱۷-۱۸

الہش ————— تہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں)

قدیم، قلمی، نایاب نسخوں سے مقابلہ اور صحیح کر کے کئی سال کی لگاتار محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے۔۔۔۔

اس قادر الکلام استاد کا کلیات تقریباً تمام اصناف سخن پر حاوی اور چار سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع میں مرتب صاحب کا ایک بسیط اور قابل قدر مقدمہ ہے جس میں موصوف نے صاحب دیوان کے حالات و سوانح نہایت تحقیق اور کمال محنت سے فراہم کر کے جمع کئے ہیں اور کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔

کلیات کے آخر میں ایک بسیط فہرست ہے جس میں ان تمام قدیم، متدو، اجنبی، ہندی، دکنی الفاظ کا حل ہے جو کلام ولی مہن جا بجا آئے ہیں۔ آخر میں پونے دو سو صفحوں کا ایک ہمیشہ اختلاف فسخ ہے جو نہایت محنت و عرق ریزی سے مرتب کیا گیا ہے اس میں تمام نسخوں سے مقابلہ کرنے پر جو جو اختلاف نظر آیا ہے، دیوان کی ہر قزل کے نسخہ کا حوالہ دے کر بتا دیا ہے۔ یہ مجموعہ ادیبان فن و تحقیق کے لئے خاص طور سے قدر کی چیز ہے۔ اور کئی ماہ کی مسلسل محنت سے تیار ہوا ہے۔ ان تمام خوبییوں کے علاوہ انجمن نے آپ مشہور عمدہ ٹائپ میں مضبوط سفید چمکے کاغذ پر طبع کیا ہے، قابل دید اور اس لائق ہے کہ ہر لائبریری اور قدر دانان اردو کے ہر کتب خانے میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود رہے۔ حجم تقریباً آٹھ سو صفحات، قیمت مجلد ۵ روپے غیر مجلد ۴ روپے۔

— (مثنوی خواب و خیال) —

حضرت سیر درد دہلوی (رح) کے چھ تہ بھائی مہر نذر کی یہ لاجواب مثنوی نایاب تھی، بہت کوششوں کے بعد بھی پتہ نہ چلتا تھا، اردو کی خوش نصیبی سے انجمن ترقی اردو کو دستیاب ہو گئی، اور اب خاص اہتمام کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ پر، طبع کی گئی ہے، جس پر انجمن کے فاضل معتد جذاب مولوی عبدالحق صاحب نے ایک زیر دست ناقدانہ مقدمہ تحریر فرما کر اس مثنوی کے خصوصیات اور معائن کو نمایاں کیا ہے۔ یہ نادر مثنوی آج تک ناپید تھی، تذکرہ میں کہوں کہوں اس کا ذکر آ جاتا ہے، حضرت سیر درد کے اشعار اور کلام کے علاوہ اس میں مصنف کی قزلیں بھی جا بجا آئی ہیں، جو قابل دید اور نہایت لطیف و پاکیزہ ہیں۔ یہ مثنوی اردو میں ایک قابل قدر اضافہ اور انجمن کی طرف سے

تیار

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں)

قدردانانِ اُردو کی خدمت میں اس سال کا جدید علمی ہدیہ ہے ' جلد بھی مضبوط عمدہ اور جدید طرز کی بغوائی گئی ہے ۔ حجم دو سو صفحے سے زائد ، قیمت ، جلد دیرۃ روپے۔

— (انتخاب کلام مہر) —

منک الشعرا مہر تقی مہر کے نام اُردو کلام سے کون قدر دانِ اُردو واقف نہیں ' یہ انہیں کے کلام کا بہترین انتخاب ہے ۔ جو جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سارے کلاذات کا عطر کھینچ لیا ہے ' یہ انتخاب ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے اور کئی یونیورسٹیوں نے اپنے نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے ۔

مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب دوسری بار انجمن ترقی اُردو پریس نے اپنے ' مشہور ' نفیس ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا ہے ۔ کاغذ چمکا ، نہایت عمدہ ' حجم دو سو صفحات سے زیادہ ' جلد نفیس اور مضبوط ۔ شروع میں فصل مرتب کا زبردستی و دلچسپ مقدمہ ہے ' قیمت مجلد دو روپے آتھ آئے ۔

— (قواعد اُردو) —

یہ کتاب جناب معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو کی بڑھ بھا تالیف ہے ' اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ زبانِ اُردو کے قواعد پر اب تک اس سے بہتر ' سہل ' جامع کتاب تصنیف نہیں ہوئی ۔ ملک میں بوجد پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور نہایت مقبول ہوئی ۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب ' یف اے میں داخل ہے ۔ اب جناب مؤلف و مرتب کی بوجد گارہی اور غرر سے نظر ثانی ' ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ چھاپی گئی ہے ۔ شروع میں اُردو زبان اور اس کے ادب پر لا جواب بسوط مقدمہ بجائے خود قابل دید ہے ۔ انجمن نے اپنے پریس میں ' عمدہ ٹائپ میں چھپوائی ہے ' کاغذ بہت عمدہ جلد نہایت نفیس اور مضبوط ' قیمت مجلد دو روپے ۸ آئے ۔

— (جاپان اور اُس کا تعلیمی نظم و نسق) —

سرکار نظام نے نواب مسعود جاگ بہادر ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو جاپان کے تعاونی نظام کے مطالعے اور تحقیق کے لئے بھیجا تھا ۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں رہ کر اس عجیب و غریب ملک کے حالات اور خاص کر تعلیمی نظم و نسق کو

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(فوت) کل جمعیتیں سکھ انگریزی میں ہوں —

نہایت غور اور تحقیق سے مطالعہ فرمایا۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دلچسپ اور فائدہ لانہ بحث کی ہے جو ہمارے اہل وطن کے لئے سبق آموز ہے۔ اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو جاپان پر اس طرز میں لکھی گئی ہے۔ ہر مہذب وطن کا فرض ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جو علاوہ دلچسپ ہونے کے پر از معلومات بھی ہے۔ خاص کر ان لوگوں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے جو ملک کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ حجم ۴۸۲ صفحے۔ قیمت فی جلد مجلد تین روپے۔

— (سرگذشت حیات (یا) آپ بیتی) —

اس کتاب میں حیات کے آغاز اور اس کے نہرو و نما کی داستان نہایت دلچسپ طرز پر بہت ہی سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ حیات کی ابتدائی حالت سے لیکر اس کا ارتقا انسان تک پہنچایا گیا ہے اور تمام تاریخی مدارج کو اس سہل طریقے سے بتایا ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکے اگرچہ جدید سے جدید علمی تحقیقات بھی اس میں آگئی ہیں مگر بیان کی سلاست میں لبرق نہیں آیا۔ یہ کتاب جدید معلومات سے لہریز ہے اور ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا لازم ہے (حجم ۳۰۰ صفحے) قیمت فی جلد مجلد ۲ روپے ۸ آنے۔

— (تذکرۂ شعراءِ اُردو) —

مولفہ میسر حسن دہلوی۔ میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُن کی مثنوی ' بدر مہر ' کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اُردو کی کسی کتاب کو نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی، بڑی کوشش سے بہم پہنچا کر طبع کی گئی ہے۔ میر صاحب کا قام اس تذکرے کی کافی شہادت ہے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب ہدوانی نے ایک بسطہ نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے کے ہے۔ قیمت فی جلد مجلد ایک روپیہ ۱۴ آنے پھر مجلد ایک روپیہ ۶ آنے۔

————— اشہر ————— تہر

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں —

— (تاریخ تھن) —

سر تھن بکل کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے۔ الف سے (ی) تک قدیم کے ہر مسئلے پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تالیف میں تاریخی اسناد سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں رسعت پیدا ہوتی ہے۔ حصہ اول غیر مجلد ایک روپیہ ۸ آنے۔ مجلد دو روپے۔ حصہ دوم مجلد دو روپے۔

— (مقدمات الطبیعات) —

یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان کے مشہور سائنس دان حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔ اس میں بظاہر فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب عام و فصل کا مرتب ہے۔ قیمت غیر مجلد ۲ روپے۔ مجلد ۲ روپے ۸ آنے۔

— (القول الاظهر) —

اسام ابن مسکویہ کی معرفۃ الآراء تصنیف (فوز الاصغر) کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب فلسفۃ الہیین کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انہیں اصول کو مطبق کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۸ آنے۔ مجلد ایک روپیہ۔

— (القول) —

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے۔ قیمت غیر مجلد ۱۰ آنے مجلد ایک روپیہ۔

— (فلسفۃ تعلیم) —

ہربرت اسپنسر کی شہور تصنیف اور مسئلۃ تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ یہ دور فکر کا بہترین کارنامہ۔ والدین و معلم کے لئے چرچا ہدایت۔ تربیت کے قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ سرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔ قیمت مجلد ۲ روپے غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے۔

تھن

المش

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں) —

— (دریائے لطافت) —

ہندوستان کے مشہور سفری سٹیج میں انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے۔ اردو صرف
ونحو اور معادرات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہے، اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب
و غریب نکات درج ہیں۔ قیمت مجلد ۲ روپے غیر مجلد ایک روپہ ۸ آئے —

— (طبقات الارض) —

اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ (۳۰۰) صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلم بند
کئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مترادفات کی فہرست بھی
مسلک ہے۔ قیمت غیر مجلد ۲ روپے۔ مجلد دو روپے ۸ آئے —

— (مشاہیر یونان و روما) —

ترجمہ ہے۔ سہرت نگاری اور انشا پردازي میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس
سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے۔ ادیبان عالم بلکہ شکسہر تک نے اس چشمے سے
فویض حاصل کیا ہے۔ وطن پرستی اور بے نفسی عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا
ہر ایک صفحہ معمور ہے۔ قیمت جلد اول غیر مجلد ۳ روپے۔ مجلد ۴ روپے
جلد دوم مجلد ۲ روپے ۸ آئے —

— (اسباق النحو) —

ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب ہی۔ اے کی تالیف ہے۔ اختصار
کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔ قیمت حصہ اول غیر
مجلد ۶ آئے۔ حصہ دوم ۴ آئے —

— (علم المعیشت) —

اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الہاس صاحب پرنی ایم۔ اے نے ملک
پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم و مشکل مسائل
کو پانی کردیا ہے، اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں۔ اشتراکیت کا باب
قابل دید ہے، حجم ۸۸۵ صفحے، قیمت مجلد ۵ روپے آتھ آئے —

انہی —————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں) —

— (تاریخ یونان) —

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سائنس شگفتگی کا نمونہ۔ اس کا نقطہ خیال خاصاً ہندوستانی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلباء جو یونان قدیم کی تاریخ سے گہرا تعلق ہیں، اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے قیمت مجلد ۲ روپے —

— (رسالہ نباتات) —

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے۔ علمی اصلاحات سے معرا۔ طلباء نباتات جس مسئلے کو انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالے میں مطالعہ کریں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے —

— (دیباچہ صحت) —

اس کتاب میں مطالعات صحت پر مثلاً (ہوا، پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ) مہسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پھیلائی ہوئی و دلپذیر ہے، ملک کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتیں ثابت ہو گا۔ حجم ایک ہزار صفحے۔ قیمت مجلد چار روپے —

— (نکات الشعراء) —

یہ اردو کا تذکرہ استاد الشعر مہر تقی مرحوم کی تالیفات سے ہے۔ اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں۔ نیز میر صاحب کی وائیں اور زبان کے بعض نکات پڑھنے کے قابل ہوں۔ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب سروانی صدر الصدور امور مدھی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

— (فلسفہ جذبات) —

کتاب کا مصنف ہندوستان کا مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کوشش پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ متعلمین نفسیات

الشہر —————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں) —

اسے مزید پالیں گے ۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے ۔ غیر مجلد دو روپے —

— (وضع اصطلاحات) —

یہ کتاب ملک کے نامور اُنشا پرداز اور عام مولوی وحید الدین 'سلم' مرحوم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے سالہا سال کے غور فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے بقول خاضل مؤلف " یہ بالکل نیا موضوع ہے ۔ سدرے عام مہوں شاہد کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی زبان میں " ۔ اس مہوں وضع اصطلاحات کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کئے گئے ہیں ۔ مخالف و موافق دہیوں کی تنقید کی گئی ہے اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکہبی، مفرد و مرکب اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں ۔ اُردو مصادر اور ان کے مشتقات ۔ فرض میگزوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق آ گئی ہیں ۔ اُردو مہوں بعض اور بھی ایسی کتابیں مہوں جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان مہوں ان کی نظر نہیں۔ لیکن اس کتاب نے زبان کی چیزیں مضبوط کردی ہیں۔ اور ہمارے حوصلے بلند کردیے ہیں ۔ اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دہی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے ۔ مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا ۔ اس نے حقیقت کا ایک نیا باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے ۔ تعداد صفحات (۳۰۵) قیمت مجلد تین روپے ۱۲ آنے —

— (معائن کلام غائب) —

ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری مرحوم کا معر کتا ناآ مضمون ہے ۔ اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے ۔ جو اس شان کی لکھی گئی ہے ۔ یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر مہوں طبع ہوا تھا ۔ صاحب نظر قلم دانوں کے اصرار سے الگ بھی طبع کیا گیا ہے ۔ قیمت مجلد ایک روپہ

— (ملل قدیمہ) —

ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے ۔ اس میں بعض قدیم اقوام ' سلطنت کلدانی ' آشوری ' بابل - ہلی اسرائیل و فلیطیہ کی معاشرت - عقائد - اور صنعت و حرفت اور ہنر کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیے ہیں۔ اُردو مہوں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس

المشہر ————— تہر

افجین ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں) —

سے ان قدیم انوار کے حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکیں اس لئے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے ۔ حالات کی وضاحت کے لئے جا بجا تصویریں دی گئی ہیں ۔ صفحہ ۲۸۴ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

— (بجلي کے کرشمے) —

یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب ہی اے ۔ نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے ۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے ۔ ہمارے بہت سے ہم وطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے ، کہاں سے آتی ہے ، کیا کام آسکتی ہے ۔ یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے ۔ اور لوگوں کو کیوں کے لئے بھی مفید ہے ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے —

— (البیرونی) —

مصفیٰ مولوی سید حسن برنی صاحب ہی اے ۔ اس کتاب میں علامہ ابروہان بیرونی کے سوانحی حالات ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصانیف کتاب الہند اور دیگر تصانیف پر تفصیل کے ساتھ قبصرہ کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو میں بالی نہیں دمی تھی اب دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور اضافہ مضامین کے ساتھ نہایت عمدہ کاغذ پر چھپ کے تیار ہوا ہے ۔ قیمت فی جلد مجلد دروڑی ۔ غیر مجلد تیرہ روپیہ —

— (تاریخ ہند) —

ہندوستان کی یہ تاریخ مولوی سید حامی صاحب فرید آبادی نے محکمہ تعلیمات سرکار نظام کی فرمائش پر لکھی ہے اور مڈل اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے ۔ اس وقت تک کوئی اور مختصر تاریخ ہند اس نقطہ نظر اور ایسی خوبی سے نہیں لکھی گئی ہے ۔ تعلیمی حلقوں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے ۔ چھوٹے سائز کے ۲۸۴ صفحہ ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ —

المشہور ————— تہر

انجمن ترقی اُردو اور فک آباد دکن

جسٹہ اہم علوم کی اصطلاحوں کا ترجمہ، جس میں حسب ذیل علوم داخل ہیں:

کئی سال کی مسلسل محنت اور مختلف ماہرین لسان کی کاوش
 و کوشش کا نتیجہ ہے۔ مصنفین و مترجمین کے لئے ناگزیر ہے۔
 حجم ۵۳۸ صفحے۔ قیمت مجاد چھ روپے۔

یہ بیش بہا کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

سے مل سکتی ہیں

— (دیوان غالب جدید و قدیم) —

یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بے حد انتظار تھا۔ اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے۔ مرزا صاحب کا قدیم کلام ملنے کی کسے توقع تھی۔ یہ مرتضیٰ حسن آذوقی تھا کہ ہاتھ آ گیا اور ریاست بھوپال کی سرپرستی میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم مجلد ۵ روپے پھر مجلد ۴ روپے (بلا مقدمہ مجلد ۳ روپے پھر مجلد ۲ روپے ۸ آنے) —

— (حقیقت اسلام) —

یہ کتاب جناب نواب سر امین جنگ بہادر نے سی۔ آئی۔ اے سی۔ ایس

انجمن ترقی اردو اور ننگ آباد دکن

(نوٹ) کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں —

آئی، ایم، اے، بی، ایل، ایف، آر، ایس' چیف سکریٹری گورنمنٹ نظام و صدرالسماء پبلی کی ہے نظیر تصنیف نوٹس آن اسلام کا ہا متعارفہ اور سلیس ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تعلیق اور اس کی صداقت کا بیان کیا ہے۔ فاضل مصنف نے ان تمام مشکل مسائل کی حقیقت کو جن میں اکثر تعلیم یافتہ جوانوں یا غیر مسلمانوں کو شبہات واقع ہوتے ہیں، زمانہ حال کے ترقی یافتہ خیالات کی روشنی میں نہایت دلاویز طریقے اور حکیمانہ استدلال سے بیان کیا ہے جس سے مصنف، مدوح کے وسیع مطالعہ، فلسفیانہ طبیعت اور غور و خوض کا پتہ ملتا ہے۔

کتاب بہت عمدہ گفٹ پر چھپی ہے۔ مجلد بارہ آنے میں مل سکتی ہے۔

— (تاریخ زوال روم) —

یہ کتب کی مشہور تاریخ کے ابتدائی (۷) ابواب کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب اپنی خوبییوں کے اعتبار سے محتاج تعریف نہیں۔ قیمت فی جلد غیر مجلد سوا دو روپہ۔

— (تاریخ عرب) —

مصلف موسیو سدیو فرانسیسی۔ عربوں کے متعلق یہ کتاب ان تمام تاریخوں کا نچوڑ ہے جو یورپ و ایشیا کے کتب خانوں کی زینت ہیں مسلمانوں کی ترقیوں اور عربوں کے کمالات کا آئینہ ہے۔ ساتھ ہی یورپ کے کذب و افترا کا بہترین جواب۔ قیمت مجلد چہرے ۷ روپے آئے۔

— (یادگار غالب) —

یعنی مرزا اسد اللہ غالب دہلوی کے مفصل حالات زندگی اور ان کے اسام، نظم و نثر، اردو فارسی پر تفصیلی ریویو اور انتخاب۔ مولفہ شمس العلماء مولانا الطاف حسین صاحب 'حالی' مرحوم۔ قیمت مجلد ۳ روپے۔

— (شعر و شاعری) —

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین 'حالی' مرحوم کے اردو دیوان کا جواب مقدمہ جس میں شعر و شاعری پر نقادانہ بحث کی گئی ہے۔ تنقیدی حواشی سے اردو زبان میں اب تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۲ روپے، غیر مجلد سوا دو روپہ۔

(نوٹ) کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں —

— (موازنہ انیس و دبیر) —

مہر انیس کی شاعری پر تفصیلی دیویو اور میڈ انیس و مرزا دبیر کا موازنہ - مولانا شبلی شہلی نعمانی، قیمت فی جلد - مجلد چار روپے - فقہر - مجلد تین روپے —

— (وکریم اُروسی) —

کالیڈاس کے مشہور ناولٹ کا اُردو ترجمہ مع ایک بسیط مقدمہ کے جس میں ہندو تدریس کی تاریخ اور نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے - مرتبہ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی - اے مرحوم - قیمت مجلد دو روپے - فقہر - مجلد تیرہ —

— (خطوط شبلی) —

علامہ شبلی مرحوم کے یہ وہ اجواب اور نادر خطوط ہیں جو مصروف نے ہماری کی مشہور تعلیم یافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام وقتاً فوقتاً کمال اخلاص و محبت اور انداز خاص کے ساتھ لکھے تھے - یہ جو ہر پارے اردو میں مولانا کے کمال انہما پر دہائی کی نایاب یادگار ہیں - طرز نگارش اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ شروع کر کے ختم کئے بغیر کتاب کو چھوڑنا دشوار ہے - شروع میں جذبات مولوی عبدالحق صاحب بی - اے - محمد انجم ترقی اردو کا ایک نہایت لطیف و سخن گسترانہ مقدمہ بھی شامل ہے، جس نے ان خطوط کے جذبات اخلاص و محبت اور نکات ادبی کو بے نقاب کر دیا ہے - مرتبہ مولوی محمد امین صاحب مارہروی و جذبات قیصر بہووالی - قیمت ایک روپیہ —

— (دیوان غالب مطبوعہ جرمنی) —

غالب کے کلام کی قدر اور جو مانگ ہے ہر صاحب ذوق جانتا ہے، ان کے دیوان کا ایک آتشیں نفاست پسند طابع کے لئے جرمنی کے مشہور کارہانی پریس میں جامعہ ملیہ نے چھپوایا تھا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا - دوسری بار پھر اسی اہتمام و نفاست سے طبع ہوا ہے - ٹائپ، کلفڈ، چھپائی، جلد، ساڑھ ہر چیز دلچسپ و دلہریب ہے - قیمت چار روپیہ —

— (مہشر خیال) —

یہ سید سجاد انصاری مرحوم وکیل بارہ بنکی کے چند دلکش ادبی و اصلاحی

المش ————— تہر

انجم ترقی اردو اورنگ آباد دکن

(فوت) کل قیمتیں سکھ انگریزی میں ہیں ۔۔

مقامیں اور نظموں کا مجموعہ ہے جو شرکت ادبہ دہلی نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے ۔
سجاد انصاری صاحب خوش فکر و خوش گفتار ادیب تھے ، ان کے مقامیں میں خاص قدرت
و ادبیت اور کلام میں خاص کیف اور بالاد خیالی و جذبات نگاری ہوتی ہے ۔ یہ مجموعہ
مرحوم کی جوانمردگی کی پانکار ہے ، جس کو سید منظور حسین صاحب نے مرتب کیا ہے ۔
لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ ، سائز مختصر ، جلد نہایت نفیس ، اوپر سلہری حروف میں
کتاب کا نام بھی لکھا ہے ۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ۔

————— (چمن) —————

یہ نہایت چھوٹا سا حسین و جمیل مجموعہ اساتذہ اردو کے پاکیزہ کلام کا انتخاب
ہے کارۃ سائز پر نہایت اعلیٰ طباعت و کتابت کے ساتھ عید کے موقع پر درست احباب
کو پیش کرنے کے لئے بہترین ادبی تحفہ ہے ۔ قیمت ۵ آنے ۔

————— (دیوان حالی) —————

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم کے قطعات
مؤلہات ، قصیدے ، مرثیے ، ترکیب بند ، رباعیاں ، تاریخیں اور متفرق اشعار
قیمت تیرہ روپیہ ۔

————— (مٹر یکولیشن کا فصاب اردو) —————

مجلس نصاب اردو جامعہ ملتانہ، حیدر آباد دکن کی ہدایت کے مطابق
مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی ۔ اے (ملوک) آنریری سکریٹری انجمن ترقی
اردو نے مرتب کیا ۔ قیمت دو روپے ۔

————— (معراج العاشقین) —————

حضرت مخدوم ابوالفتح صدرالدین سید محمد حسینی گیسو دراز بلندہ نواز (رح)
کی تصنیف ہے ۔ اس میں حضرت کے بعض مواعظ و اوشارات قدیم اردو یعنی دکنی
اردو میں لکھے ہیں ۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تصحیح و
ترتیب اور مقدمے کے ساتھ چھپی ہے ۔ قیمت ۶ آنے ۔

————— ہتھ —————

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

(نوٹ) کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں —

—————(وقائع عالمگیر)—————

حضرت اردنگ زیب سلطان ہند عالمگیر کے وقائع زندگی جو خود ان کے مکتوب اور مستند مورخین کی روایات پر مبنی ہیں۔ اور جن سے ان کے حقیقی کیریئر و رواداری، عدل چرٹی اور تشریع مذہبی کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ مرتبہ چودھری نبی احمد صاحب سندھاپوری مجلد ۲ روپے —

—————(افغان بادشاہ)—————

اعلیٰ حضرت غازی امان اللہ خاں کی عظیم الشان چشم دید داستان حیات اس کتاب لاجواب کو محمد حسین خاں بی۔ اے (علیگ) ڈائرکٹر جنرل پبلک انسٹرکشن افغانستان نے بڑی عبق و بڑی سے مرتب کیا ہے، شائقین سہر و تاریخ کے لئے خصوصاً اور کافہ مسلمانوں کو عموماً لازم ہے کہ اس کتاب کو فور سے مطالعہ فرما کر استفادہ کریں۔ قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے —

—————(پریم پچیس)—————

ملک کے مشہور انشا پرداز منشی پریم چند صاحب کے نہایت دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔ حصہ اول ڈیڑھ روپیہ، حصہ دوم ڈیڑھ روپیہ —

—————(عروس ادب)—————

مولوی سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلکرامی کے اخلاقی ادبی تاریخی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ۔ حجم ۲۲۲ صفحہ۔ سائز ۲۶ x ۲۰ کاغذ عمدہ سفید، لکھائی چھپائی بہت خوشنما۔ قیمت فی جلد دو روپے —

—————(خیالات ارونگ)—————

مشہور امریکن مصنف واشنگٹن ارونگ کے بعض دلچسپ مضامین کا با مضافہ اردو ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی آباد ضلع میرٹھ قیمت ۸ آنے —

الہش—————تہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکہ انگریزی میں ہیں —

—————(سیر المصنفین)—————

جس میں نثران اردو نے حالات زندگی اور اردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی کا ذکر کیا گیا ہے مصنفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تلیہا بی۔ اے (ملیک) قیمت دو روپے —

—————(مصنوعی بیوی)—————

مشہور ہر دلچیز مغربی ناولسٹ آر ایچ بول کے ایک نہایت دلچسپ انگریزی ناول ”ہز ہوک بی لیو وائف“ کا اردو ترجمہ از مولوی عباس حسین صاحب لطفی، قیمت ۱۲ آنے —

—————(خواتین افگورہ)—————

مولفہ ملا توحیدی صاحبہ - ترکی کی مشہور و معروف خواتین کے گانائے - اس کتب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ جدوجہد میں ترکی خواتین نے کس جوش اور قابلیت سے حصہ لیا ہے - قیمت ۱ روپہ —

—————(جہاں آرا بیگم)—————

جہاں آرا بیگم ہند شاہجہان کی سوانح عمری جو نہایت مستند تاریخوں سے لکھی گئی ہے - مولفہ مولوی ضیاء الدین احمد برنی صاحبہ بی اے قیمت ۸ آنے —

(دارالمصنفین اعظم گڑھ)		سیرۃ النبی حصہ سوم	۶ روپیہ
تاریخ فقہ	۴ روپیہ	شعر العجم مکمل ۵ حصے	۱۳ روپیہ
خلائے راشدین	۳ روپیہ ۸ آنے	الکلام	۲ روپیہ
مہاجرین	۴ روپیہ	اسوۃ صحابہ مکمل دو حصے	۸ روپیہ
سیرۃ النبی حصہ اول	۴ روپیہ	انقلاب الامم	۲ روپیہ
سیرۃ النبی حصہ دوم	۳ روپیہ ۸ آنے	مکالمات برکلی	۴ روپیہ

الہش ————— تہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(نوٹ) کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں —

۱ روپیہ	تاریخ ہند قدیم	۲ روپیہ ۴ آنہ	سیرالصحابیات
	(الناظر پریس - لکھنؤ)	۲ روپیہ	روح الاجتماع
۱ روپیہ	فسانہ جوش	۲ روپیہ	ابن رشد
۱۲ آنہ	مجموعہ قصائد موسیٰ	۵ روپیہ	گل رعنا
۴ آنہ	دو قلم بدہ	۳ روپیہ ۸ آنہ	سہرا انصار حصہ اول
	مسالک النظر فی نبوت	۳ روپیہ ۸ آنہ	سہرا انصار حصہ دوم
۵ آنہ	سہد البشر	۴ روپیہ	شعرالہند حصہ اول
۵ آنہ	حکایت لیلیٰ مجلدوں	۴ روپیہ	شعرالہند حصہ دوم
۵ آنہ	مقتل فریب مغربی معمل خانے		(جامعہ مایہ دہلی)
۱ روپیہ ۸ آنہ	وگدھ اوردی	۱ روپیہ	تاریخ نجد
	فلسفیانہ مضامین عبدالعاجد صاحب	۲ روپیہ ۸ آنہ	عربوں کا تمدن
۱ روپیہ ۸ آنہ		۲ روپیہ	تاریخ فلسفہ اسلام
۷ روپیہ ۸ آنہ	تاریخ عرب مجلد	۳ روپیہ	تاریخ اند و لکھن
۳ روپیہ	سوازنہ انیس و دبیر	۴ روپیہ	سیرۃ الرسول
۱ روپیہ ۴ آنہ	مقدمہ شعر و شاعری	۲ روپیہ	خلافت راشدہ
۶ آنہ	اصول الذبح	۴ روپیہ	خلافت بنی امیہ
۱ روپیہ	مسلمانان اندلس	۲ روپیہ	خلافت عباسیہ
۱ روپیہ	اسرار رنگون	۲ روپیہ	خلافت عباسیہ بغداد
۱ روپیہ	خوان دعوت	۲ روپیہ	خلافت عباسیہ مصر
۲ آنہ	مصدومی شوہر	۱ روپیہ	مبادی معاشیات
۸ آنہ	الاحسان	۴ آنہ	دنیا کے مسئلے والے
۴ آنہ	ارض نہرین	۴ روپیہ	قواعد عربی
۴ آنہ	جہات نظامی	۴ آنہ	اسلامی تہذیب و قومی تعلیم
۴ آنہ	خطاب	۴ آنہ	تربیتی کی کہانیاں

————— شہر —————

(نوٹ) کل قیمتیں سکے انگریزی میں ہیں —

مہلاد ندوی	۴ آنہ	انجمن زریں مجلد	
فریاد امت	۳ آنہ	قصائد ذوق	۲ روپیہ
(نظامی پریس ہدایوں)			
قاموس المشاہیر جلد اول	۶ روپیہ	مراتی انہس جلد دوم قسم دوم	۸ روپیہ
قاموس المشاہیر جلد دوم	۶ روپیہ	(تھا ذیف نورالہی و صاحبان)	
نکات غالب مجلد	۱ روپیہ	موجودہ لندن کے اسرار	۱ روپیہ ۴ آنہ
دیوان غالب مشرح مجلد	۲ روپیہ ۸ آنہ	فائیک ساگر (یعنی دنیا کے قراماکی تاریخ)	
دیوان جان صاحب مجلد	۳ روپیہ	مجلد ۳ روپیہ غیر مجلد	۲ روپیہ ۸ آنہ
دیوان درد	۱ روپیہ ۴ آنہ	نہن توہیں	۸ آنہ
دیوان غالب (لنڈنری ایڈیشن) ۳ روپیہ		ظہر کی موت	۴ آنہ
خطوط سر سہد قسم اول	۳ روپیہ	قزاق	۸ آنہ
خطوط سر سہد قسم دوم	۲ روپیہ	بکڑے دل	۸ آنہ
لہتو گرافی مجلد	۱ روپیہ ۸ آنہ		



تاریخ

:0:

تاریخ و تراجم اور آثار و عتائق کا سہ ماہی رسالہ

(ایڈیٹر)

[حکیم - سید شمس الدہ قادری]

(۱) رسالے کے حسب ذیل مقاصد ہوں گے - (۱) تاریخ و تراجم اور آثار و عتائق

پر تحقیقی مضامین شائع کرنا (۲) تاریخ کے تاریک پہلو پر روشنی ڈالنا -

(۳) اسات کے آثار و عتائق سے اہل ملک کو واقف کرانا (۴) تبصروں کے

ذریعے بلند پایہ تصنیفات سے اردو خواں طبقے کو روشناس کرانا —

(۲) ان مباحث کی جانب زیادہ توجہ کی جائیگی جن کا تعلق اسلام اور ہندوستان

و دکن سے ہو گا —

(۳) غیر زبانوں سے بہترین مضامین کے ترجمے یا ان کے اقتباس بھی شائع

کئے جائیں گے —

(۴) رسالہ سال میں چار بار ' جنوری - اپریل - جولائی - اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے علاوہ معصوم قاک —

مضامین اور خریداری کی درخواستیں ایڈیٹر کے نام ذیل کے پتے پر آنا چاہئے۔

:0:

حکیم سید شمس الدہ قادری . ایڈیٹر رسالہ تاریخ - کوئٹہ اکبر جاہ - حیدرآباد دکن

کتابوں کی تجارت

ایک اچھی اور مفید تجارت ہے اور اگر آپ اس تجارت میں روپیہ لگا سکتے ہوں تو

دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ

کے کاغذات و قواعد مجھ سے منگالیں۔ یہ لمیٹڈ تجارتی کمپنی ترقی و حفاظت اردو اور اشاعت و طباعت وغیرہ کا پر منفعت کاروبار کرنے کے لئے دہلی میں قائم ہوئی ہے اور عنقریب کاروبار شروع کرنے والی ہے۔

آپ کا بھی خواہ

منیجنگ ڈائریکٹر دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ۔ دہلی

اردو

نرخ نامہ اجرت اشتہارات

ایک بار کے لئے

۲ کالم پورا صفحہ ۱۰ روپے سکے انگریزی۔ ایک کالم (آدھا صفحہ) ۵ روپے سکے انگریزی۔ نصف کالم (چوتھائی صفحہ) ۲ روپے ۸ آنے۔

چار بار کے لئے

۲ کالم یعنی پورا صفحہ ۴۰ روپے سکے انگریزی۔ ۱ کالم (آدھا صفحہ) ۲۰ روپے نصف کالم (چوتھائی صفحہ) ۱۰ روپے۔

رسالے کے جس صفحے پر اشتہار شائع ہوگا وہ اشتہار دینے والوں کی خدمت میں نہونے کے لئے بھیج دیا جائے گا۔ پورا رسالہ لینا چاہیں تو اس کی قیمت بحساب ایک روپیہ بارہ آنے سکے انگریزی فی رسالہ اس کے علاوہ لی جائے گی۔

الہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

رسالہ اُردو کے خریداروں کے ساتھ خاص رعایت

رسالہ اُردو کے خریداروں کو انجمن ترقی اردو کی شائع کی ہوئی کتابیں فی روپیہ چار آنے کی قیمت کے ساتھ دی جائیں گی۔ امید ہے کہ فاضلین اس رعایت سے فائدہ اٹھا لیں گے۔

دیگر مقامات کی کتابیں جو بطور ایجنسی انجمن میں فروخت ہوتی ہیں ان کی قیمتوں میں کوئی کمی نہیں کی جا سکتی۔

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اپنے ان مہربان معارفین کی فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو، وہ بغیر ان سے دوبارہ دریافت کئے، تیار ہوتے ہوئے ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی روائف کر دی جایا کرے۔ امید ہے کہ قدر دانان زبان اردو ہمیں عام طور پر اس قسم کی اجازت دیدیں گے کہ ان کے اسماء گرامی اس فہرست میں درج کر لئے جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہو، فوراً بغیر دریافت کئے روائف کر دی جایا کرے۔ یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ہوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہرا تھو جائے گی۔ امید ہے کہ ہمارے وہ معارفین جو اردو کی ترقی کے دل سے بھی خواہ ہیں اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے۔

ان معارفین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کر کے روانہ ہوں گی۔

الہ شہر

منیجر انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد (دکن)

